۸۲۔ الانفطار

نام پہلی ہی آیت میں آسمان کے انفطار (پھٹ جانے) کی خبر دی گئی ہے۔ اسی مناسبت سے اس سورہ کا نام الانفطار ہے۔

زمانۂ نزول یہ سورہ بالاتفاق مکی ہے۔ اور مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا اور سورہ تکویر کا زمانۂ نزول قریب قریب ایک ہی رہا ہوگا یعنی مکہ کا ابتدائی دور۔

مرکزی مضمون اس سورہ کا بھی مرکزی مضمون جزائے عمل ہی ہے۔ لیکن استدلال ایک دوسرے پہلو سے کیا گیا ہے اور اس اہتمام سے بھی آگاہ کر دیا گیا ہے، جو ہر شخص کی عملی زندگی کو ریکارڈ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے کر رکھا ہے۔

نظم کلام آیت ۱ تا ۵ میں قیامت کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اور بتایا گیا کہ جب یہ حادثۂ عظیم رونما ہوگا، تو انسان کا کیا دھرا سب اس کے سامنے آجائے گا۔

آیت ۶ تا ۸ میں انسان کو احساس دلایا گیا ہے کہ جس خدا نے انسان کو بہترین قالب میں ڈھالا اور اعلیٰ صلاحیتوں سے نوازا، اسے کیا من مانی کرنے کے لئے یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا؟ اس کی اپنے خدا کی ساتھ وفاداری اور غیر وفاداری کا امتحان نہیں ہوگا؟ اور کیا وہ اس کے حضور اپنے طرز عمل کے لئے جوابدہ نہیں قرار پائے گا؟

آیت ۹ تا ۱۲ میں اس اہتمام کا ذکر ہے، جو اللہ نے ہر شخص کے اعمال کو ضبطِ تحریر میں لانے کیلئے کر رکھا ہے۔

آیت ۱۳ تا ۱۹ میں مختصر الفاظ میں نیکوکاروں اور بدکاروں کا انجام سامنے لایا گیا ہے۔ اور متنبہ کیا گیا ہے کہ پیشی کے دن کسی کے بس میں کچھ نہ ہوگا۔ اور سارے اختیارات اللہ ہی کے ہاتھ میں ہوں گے۔

سُوْرَةُ الْاِنْفِطَارِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۝١

وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۝٢

وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝٣

وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ۝٤

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ۝٥

يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۝٦

الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝٧

فِيْۤ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ۝٨

كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ۝٩

وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝١٠

كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۝١١

يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝١٢

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۝١٣

وَّاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ۝١٤

يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ۝١٥

وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ ۝١٦

وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۝١٧

ثُمَّ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۝١٨

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ۗ وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ۝١٩

۸۲۔ سُوْرَةُ الْاِنْفِطَارِ

آیات:۱۹

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ جب آسمان پھٹ جائے گا، ۱؎

۲ اور جب تارے بکھر جائیں گے، ۲؎

۳ اور جب سمندر بہادئے جائیں گے، ۳؎

۴ اور جب قبریں اکھیڑ دی جائیں گی، ۴؎

۵ اس وقت ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ اس نے آگے کیا بھیجا ہے؟ اور پیچھے کیا چھوڑا ہے ؟ ۵؎

۶ اے انسان! تجھے کس چیز نے اپنے رب کریم کے بارے میں دھوکہ میں ڈال رکھا ہے؟ ۶؎

۷ جس نے تجھے بنایا، اور ٹھیک ٹھیک (انسان) بنایا، اور تیری بناوٹ میں اعتدال رکھا،

۸ اور جس صورت میں چاہا تجھے ترکیب دیا۔ ۷؎

۹ نہیں ۸؎! مگر تم جزاوسزا کو جھٹلاتے ہو۔ ۹؎

۱۰ حالانکہ تم پر نگراں مقرر ہیں۔ ۱۰؎

۱۱ گرامی قدر کاتب۔ ۱۱؎

۱۲ جو تمہارے ہر فعل کو جانتے ہیں۔ ۱۲؎

۱۳ یقیناً نیکوکار ۱۳؎ عیش ونشاط میں ہوں گے۔

۱۴ اور بدکار ۱۴؎ جہنم میں۔

۱۵ وہ اس میں جزا کے دن داخل ہوں گے۔

۱۶ اور اس سے غائب نہ ہوسکیں گے۔ ۱۵؎

۱۷ اور تمہیں کیا معلوم کہ جزا کا دن کیا ہے؟

۱۸ پھر (سن لو!) تمہیں کیا خبر کہ جزا کا دن کیا ہے؟ ۱۶؎

۱۹ وہ دن جب کوئی شخص کسی کے لئے کچھ نہ کر سکے گا۔ اور معاملات صرف اللہ ہی کے اختیار میں ہوں گے۔ ۱۷؎

۱۔ اس مادی دنیا کو دیکھ کر انسان ماضی میں یہ خیال کرتا رہا ہے کہ اس کے یہ لیل ونہار ہمیشہ یہی رہیں گے۔ اور وہ کبھی کسی حادثہ سے دوچار ہونے والی نہیں۔ اور جہاں تک موجودہ سائنس کا تعلق ہے اس کی ترقی نے انسان کو یہ اعتراف کرنے پر مجبور کر دیا ہے کہ سورج کی طاقت بھی زائل ہوسکتی ہے۔ اور یہ کائنات عظیم حادثہ سے دوچار ہوسکتی ہے۔ البتہ سائنس دانوں کے اندازہ کے مطابق یہ صورت اربوں سال بعد پیش آئے گی۔

لیکن قرآن جو کلام الٰہی ہے صرف امکان ہی کی بات نہیں کرتا، بلکہ مثبت طور پر اور واشگاف الفاظ میں یہ خبر دیتا ہے کہ عنقریب یہ کائنات عظیم حادثہ سے دوچار ہوگی۔ اور زمین تو زمین آسمان کا نظام بھی درہم برہم ہوجائے گا۔ تاکہ ایک نئی دنیا ایک نئے نظام کے ساتھ وجود میں لائی جائے۔ ظاہر ہے نئی تعمیر کے لئے تخریب ضروری ہوتی ہے۔ اس لئے جہان نو کی تعمیر کے لئے اس دنیا کی شکست وریخت کچھ بھی تعجب خیز نہیں۔

قیامت کے دن آسمان وزمین کے درہم برہم ہوجانے کے ذکر سے بائبل بھی خالی نہیں ہے۔

''اس دن آسمان بڑے شور وغل کے ساتھ برباد ہوجائیں گے اور اجرام فلک حرارت کی شدت سے پگھل جائیں گے۔ اور زمین اور اس پر کے کام جل جائیں گے۔'' (۲۔ پطرس ۳:۱۰)

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن جس حادثہ عظیم کی خبر دے رہا ہے، وہ کوئی نئی خبر نہیں ہے جو قرآن نے پہلی مرتبہ دی ہو، بلکہ نوع انسانی کو وحی الٰہی کے ذریعہ برابر آگاہ کیا جاتا رہا ہے۔ البتہ قرآن جتنے مؤثر پیرایہ میں اور جس تفصیل کے ساتھ قیامت کی تصویر کشی کر رہا ہے، اس کی نظیر ان تحریف شدہ آسمانی کتابوں میں سے کسی کتاب میں بھی ملنا مشکل ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ قرآن کے اس بیان سے قیامت کے بارے میں زبردست یقین پیدا ہوجاتا ہے۔ اور دل ودماغ کو ایسا جھٹکا لگتا ہے کہ دنیا کے بارے میں انسان کے زاویۂ نظر میں عظیم تبدیلی رونما ہوجاتی ہے۔

۲۔ ستارے بزم جہاں کی رونق ہیں۔ لیکن جب یہ بزم ہی ختم کر دی جائے گی تو ان قمقموں کے باقی رہنے کا کیا سوال؟ جس قانونِ کشش نے ان کو خلا میں منظم کر رکھا ہے اس میں ذرا سا اختلال ان کو منتشر کرنے کے لئے کافی ہے۔ ستاروں کے گرنے کا ذکر انجیل میں بھی موجود ہے۔

''سورج تاریک ہوجائے گا اور چاند اپنی روشنی نہ دے گا اور ستارے آسمان سے گریں گے اور آسمانوں کی قوتیں ہلائی جائیں گی۔'' (متی ۲۴: ۲۹)

۳۔ یعنی سمندر جوش میں آکر اپنے حدود کو توڑ کر بہہ پڑیں گے۔ اور ساتھ ہی جیسا کہ سورۂ تکویر میں بیان ہوا، بھڑک اٹھیں گے۔

۴۔ قبروں کے اکھیڑ دیئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ جوں ہی قیامت کا دوسرا صور پھونک دیا جائے گا، زمین کے اندر سے مُردے اس طرح باہر نکل پڑیں گے جیسے قبریں اکھیڑ کر مردوں کو باہر نکالا گیا ہو۔ قیامت تک جتنے انسان بھی پیدا ہوئے اور مر گئے ان سب کو زمین اُگل دے گی۔ خواہ کوئی قبر میں دفن ہوا ہو یا سمندر میں غرق ہوا ہو اور خواہ کسی کی لاش جلا دی گئی ہو یا خلا میں اسکے اجزاء منتشر ہو گئے ہوں۔

۵۔ آگے بھیجے (مَاقَدَّمَتْ) سے مراد آدمی کا اچھا یا برا عمل ہے، جو اس نے اخروی زندگی کے لئے کیا۔ گویا انسان روزانہ اپنے اعمال کا پارسل نئی دنیا کو بھیجتا ہے، جہاں قیامت کے دن وہ پہنچنے والا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی شخص صدا بہار پھولوں کا پارسل بھیجتا ہے، تاکہ اس کے لئے جنت کی بہار بن جائیں۔ اور کوئی شخص آتش گیر مادہ کا پارسل بھیجتا ہے، تاکہ اس کو جلانے کے لئے ایندھن کا کام دے۔

پیچھے چھوڑنے (مَاأَخَّرَتْ) سے مراد تقویٰ اور نیکی کے وہ کام ہیں، جو انسان کے کرنے کے تھے، لیکن اس نے نہیں کئے۔ اس طرح قیامت کے دن ہر شخص کو اس کی کارکردگی اور اس کی کوتاہیاں (Commissions & Ommissions) اچھی طرح معلوم ہوجائیں گی۔

۶۔ یہاں خدا کی صفتِ کریمی کا حوالہ دینے سے مقصود اس کے محسن ہونے کا احساس دلانا ہے، تاکہ آدمی کے اندر احساسِ ذمہ داری ابھرے۔ خدا کے محسن اور مہربان ہونے کا تقاضا یہ تھا کہ آدمی اس کی طرف لپکتا اور اس کا شکر گذار اور وفادار بندہ بن کر رہتا۔ لیکن وہ اس سے بے نیازی اختیار کرتا ہے اور

اس کے حضور اپنے کو جوابدہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ یہ سراسر دھوکا ہے جس میں انسان مبتلا رہتا ہے۔ لیکن اس دھوکہ میں پڑنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ صرف خواہش پرستی ہے، جو اسے اپنے مہربان رب سے بغاوت پر آمادہ کرتی ہے۔

۷۔ انسان دنیا کی ممتاز ترین مخلوق ہے۔ اور اس کی تخلیق میں خالق کی صناعی پوری طرح نمایاں ہے۔ انسان کا پہلے ہیولیٰ (لوتھڑا) تیار ہوتا ہے۔ اس کے بعد اسے اس طرح درست کیا جاتا ہے کہ وہ متناسب اعضاء کی شکل میں متشکل ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے قویٰ میں ایسا توازن رکھا جاتا ہے کہ اس کا وجود دنیا کی سب سے معتدل مخلوق ہونے کی گواہی دیتا ہے۔ مزید یہ کہ نوع انسانی کا ہر فرد شکل وصورت میں دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ دنیا میں اربوں انسان پیدا ہوتے ہیں اور ان سب کا موڈل ایک نہیں ہوتا، بلکہ ہر ایک کا موڈل الگ ہوتا ہے، تاکہ اس کی انفرادیت اور اس کا تشخص برقرار رہے۔ غرضیکہ انسان کی ساخت اور اس کی شکل وصورت کے مشاہدہ سے اس کے خالق کے کمالِ قدرت اور حیرت انگیز صناعی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ احساس بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ انسان کے حق میں وہ کتنا بڑا محسن ہے، جس نے اس کو دنیا کی بہترین مخلوق بنا کر اٹھایا!

۸۔ یعنی تمہارا یہ گمان صحیح نہیں کہ دنیا یونہی چلتی رہے گی، نہ قیامت آئے گی اور نہ خدا کے حضور تمہاری پیشی ہوگی۔

۹۔ یعنی قیامت کی آمد کی جو خبر قرآن دے رہا ہے، اس کو جھٹلانے کی اصل وجہ یہ ہے کہ تم جزا وسزا کی حقیقت کو تسلیم کرنا نہیں چاہتے۔ کیوں کہ اس کو تسلیم کرنے کے بعد انسان کو خواہشاتِ نفسانی کے علی الرغم ایک ذمہ دارانہ زندگی گذارنی پڑتی ہے۔

آج بھی انسان نے جزا وسزا کے مذہبی تصور سے بچنے کے لئے کائنات کی ایسی ''سائنٹیفک'' توجیہہ کی ہے کہ ذہن نہ خدا کی طرف منتقل ہوتا ہے اور نہ قیامت کی طرف۔

۱۰۔ یعنی تم جزا وسزا کو جھٹلانا چاہو تو جھٹلاؤ، اس سے حقیقت نہیں بدلتی۔ حقیقت یہ ہے کہ جزا وسزا کا معاملہ لازماً پیش آنا ہے۔ اور اس کے لئے اللہ نے یہ اہتمام کیا ہے کہ تمہارے اعمال کو ریکارڈ کیا جائے۔

نگراں سے مراد وہ فرشتے ہیں جو انسان کے قول وفعل کا ریکارڈ تیار کرنے کے لئے اللہ کی طرف سے مقرر ہیں۔ ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے لگے ہوتے ہیں۔ ایک دائیں جانب اور دوسرا بائیں جانب۔

۱۱۔ مراد قول وعمل کو ریکارڈ کرنے والے فرشتے ہیں۔ ان کی صفت ''کراماً'' (گرامی قدر، معزز) بیان کی گئی ہے، جس سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ یہ انتہائی ذمہ داری کے ساتھ اپنی ڈیوٹی انجام دیتے ہیں۔ ان کے بارے میں نہ یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص نیکی کرے اور یہ لکھیں نہیں۔ اور نہ یہ اندیشہ ہوسکتا ہے کہ ایک کی بدی دوسرے کے کھاتہ میں جمع کر دیں۔ یہ خفیہ طریقہ پر مگر باوقار انداز میں نہایت ایمانداری کے ساتھ اپنا فرض انجام دیتے رہتے ہیں۔ لہٰذا ان کو دنیوی حکومتوں کی سی آئی ڈی پر قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا، جس کے علم کا دائرہ بھی محدود ہوتا ہے۔ اور جو نا فرض شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے الٹی سیدھی رپورٹ پیش کرتی رہتی ہے۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ اس دنیوی خفیہ پولس پر بھی اللہ کی ''خفیہ پولس'' مقرر ہے، جو ان کی ساری حرکتوں کو ضبط تحریر میں لا رہی ہے۔

فرشتوں کی کتابت کی نوعیت تو اللہ ہی کو معلوم ہے۔ البتہ موجودہ سائنس اور ٹیکنولوجی کے دور میں یہ سمجھنا ہمارے لئے کچھ مشکل نہیں رہا کہ انسان کی تمام حرکات وسکنات کو، اور اس کی زبان سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کو محفوظ کیا جاسکتا ہے۔ فلم، ریڈیو، فوٹو، ٹیلیویژن اور ٹیپ ریکارڈنگ اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ اور اب تو یہ بھی ممکن ہوا ہے کہ زمین پر بیٹھ کر ہم لاکھوں اور کروڑوں میل دور چاند، مریخ اور زحل جیسے سیاروں کی تصویریں منگائیں۔ اصل میں موجودہ سائنس نے دو اہم قوانینِ قدرت کا انکشاف کیا ہے، جن میں سمجھنے والوں کے لئے بہت کچھ رہنمائی کا سامان موجود ہے۔ ایک یہ کہ ہماری تصویر

ہر لمحہ فضا میں بنتی رہتی ہے۔ اسی تصویر کو محفوظ کرنے کی تکنک (Technic) سائنس نے اختیار کی ہے۔

اسی طرح ہماری آواز ہوا میں لہریں پیدا کرتی ہے۔ ان لہروں کو کیسٹ میں محفوظ کر کے اسی آواز کو پھر سنا جا سکتا ہے۔ یہ سب کچھ جب انسان کے لئے ممکن ہوا ہے۔ اور ممکن بھی ایسا کہ اسی پر موجودہ تمدن کی عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ تو پھر انسان کے لئے یہ باور کرنا کیا مشکل ہے کہ جس خدا نے یہ قانون قدرت بنایا ہے اس نے اس بات کا بھی اہتمام کیا ہے کہ ہر شخص کی پوری زندگی کو فلمایا جائے، اور قیامت کے دن ہماری بولتی فلم ہمارے سامنے پیش کر دی جائے۔ اس وقت اپنی بولتی فلم کو دیکھ کر انسان کے ہوش ٹھکانے نہیں رہیں گے۔ مگر انسان آج ہی یہ یقین کر لے کہ اس کی پوری زندگی کو فلمایا جا رہا ہے۔ اور اس کی بولتی فلم اسے دکھائی جانے والی ہے، تو انسان اپنے رویہ میں بڑا محتاط اور ذمہ دار ہوگا۔ اور کبھی ایسا کام کرنے یا ایسی بات زبان سے نکالنے کے لئے آمادہ نہیں ہوگا، جو کل آخرت کے ٹیلیویزن پر وہ دیکھنا اور سننا پسند نہیں کرے گا۔

۱۲۔ یہاں افعال کا ذکر ہے اور سورہ ''ق'' میں صراحت ہے کہ جو لفظ بھی انسان اپنی زبان سے نکالتا ہے، اس کو نوٹ کرنے کے لئے ایک فرشتہ موجود ہوتا ہے۔ اور یہ وضاحت بھی ہے کہ یہ فرشتے دو ہوتے ہیں جو دائیں اور بائیں جانب بیٹھے نگرانی کر رہے ہوتے ہیں۔

اِذْ یَتَلَقَّی الْمُتَلَقِّیٰنِ عَنِ الْیَمِیْنِ وَ عَنِ الشِّمَالِ قَعِیْدٌ۔ مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ۔ (ق ۱۷۔۱۸)

ترجمہ: جب دو اخذ کرنے والے دائیں اور بائیں بیٹھے اخذ (ریکارڈ) کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ کوئی لفظ بھی زبان سے نہیں نکالتا مگر اس کے پاس ایک مستعد نگراں موجود ہوتا ہے۔ (سورہ ق ۱۷، ۱۸)

۱۳۔ سورہ کا مضمون اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ نیکو کار وہ لوگ ہیں، جن کا بنیادی وصف رب کریم کے حضور جوابدہی کا احساس ہے۔

۱۴۔ جو لوگ رب کریم کے حضور جوابدہی کے قائل نہ ہوں اور آخرت کی جزا و سزا کو جھٹلائیں، وہ قرآن کی اصطلاح میں فاجر (بدکار) ہیں۔ کیوں کہ جہاں خدا کے حضور پیشی کا تصور نہ ہو وہاں پوری زندگی غلط ہو کر رہ جاتی ہے۔

۱۵۔ یعنی وہ جہنم میں لازماً داخل ہوں گے۔ اور داخل ہونے کے بعد اس سے نکل بھاگنے کی کوئی صورت ممکن نہ ہوگی۔ وہ ہمیشہ کے لئے اسی میں پڑے رہیں گے۔

۱۶۔ سوال کو اس لئے دہرایا گیا ہے تاکہ جزا کے دن کی اہمیت واضح ہو جائے۔ اور عدالت خداوندی میں حاضری کے تصور سے انسان لرز اٹھے۔

۱۷۔ یعنی دنیا میں انسان جو بااختیار نظر آتا ہے۔ قیامت کے دن بالکل بے اختیار ہوگا۔ خواہ دنیا میں وہ شاہ رہ چکا ہو یا گدا۔ اس روز انسان کی بے بسی کا یہ حال ہوگا کہ وہ اپنے ہی لئے کچھ کر نہ سکے گا۔ کُجا یہ کہ دوسروں کے لئے کرے! اختیار اور اقتدار سب کچھ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہوگا اور معاملات کے فیصلے وہ خود فرمائے گا۔

یہ ہے عدالتِ خداوندی میں پیشی کا وہ تصور، جو قرآن پیش کرتا ہے اور جو عقیدۂ آخرت کا لازمی جز ہے۔ بخلاف اس کے عقیدۂ تناسخ ایک چکر ہے، جس میں عدالتِ خداوندی میں پیشی کا کوئی مرحلہ پیش آنے والا ہی نہیں ہے۔ اس سے اسلام کے عقیدۂ آخرت اور مشرکین کے عقیدۂ تناسخ کے بنیادی فرق کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

سورۃ المطففین

۸۳۔ المطفّفین

نام سُورہ کے آغاز ہی میں مطففین (ناپ تول میں کمی کرنے والوں) کو وعید سنائی گئی ہے۔اس مناسبت سے اس سورہ کا نام ''**المُطفِّفِین**'' ہے۔

زمانۂ نزول مکی ہے اور مضمون سے انداز ہوتا ہے کہ یہ اس وقت کی تنزیل ہے، جب قرآن کی دعوت اہل مکہ کے سامنے پیش ہو چکی تھی۔ وہ یوم جزا کا انکار کر رہے تھے اور اہل ایمان کا مذاق اڑا رہے تھے۔

مرکزی مضمون رب العالمین کے حضور پیشی اور جزائے عمل ہے۔اس کا احساس دلانے کے لئے معاملات کی اس خرابی پر گرفت کی گئی ہے، جس میں آخرت کا احساس نہ رکھنے والے لوگ عام طور سے مبتلا ہوتے ہیں۔

نظمِ کلام سورہ انفطار سے اس کا ربط بالکل واضح ہے۔اس میں آگاہ کیا گیا تھا کہ اعمال کو ضبطِ تحریر میں لانے کے لئے فرشتے مقرر ہیں۔اس سورہ میں اس حقیقت سے باخبر کیا گیا ہے کہ انسان کی عملی زندگی کا ریکارڈ، اس کے مرنے کے بعد عالم برزخ میں محفوظ رکھنے کا انتظام، اللہ تعالیٰ نے کر رکھا ہے۔

آیت ۱ تا ۶ میں کاروباری معاملات میں بد دیانتی اور فریب کاری پر گرفت کرتے ہوئے، خدا کے حضور جوابدہی کا احساس دلایا گیا ہے۔

آیت ۷ تا ۱۷ میں اس حقیقت سے باخبر کیا گیا ہے کہ بدکاروں کا نامۂ اعمال ان کے مرنے کے بعد عالم برزخ میں ایک خاص دفتر میں ہے، جو مجرمین ہی کے لئے مخصوص ہے۔اور قیامت کے دن اس ریکارڈ کی بنیاد پر فیصلہ کیا جائے گا۔اور اس روز ان کا انجام بڑا ہی حسرتناک ہوگا۔

آیت ۱۸ تا ۲۸ میں نیک کردار لوگوں کو خوشخبری دی گئی ہے کہ ان کا نامۂ اعمال، ان کے مرنے کے بعد عالم برزخ میں اعلیٰ درجہ کے دفتر میں، جو نیکوکاروں کے لئے مخصوص ہے، محفوظ کیا جاتا ہے۔اور قیامت کے دن اس ریکارڈ کی بنیاد پر فیصلہ کیا جائے گا۔اور اس روز وہ فائز المرام ہوں گے۔

آیت ۲۹ تا ۳۶ میں اہل ایمان کو تسلی دی گئی ہے کہ وہ منکرین کے طنز و تشنیع سے کبیدہ خاطر نہ ہوں۔آج وہ تم پر ہنس رہے ہیں مگر کل تم ان پر ہنسو گے۔

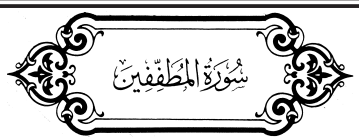

سُوْرَةُ الْمُطَفِّفِيْنَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝١

الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝٢

وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝٣

اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝٤

لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝٥

يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝٦

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ۝٧

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ۝٨

كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝٩

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝١٠

الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝١١

وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝١٢

اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝١٣

كَلَّا بَلْ ٚ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝١٤

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۝١٥

ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ۝١٦

۸۳۔ سُوْرَۃُ الْمُطَفِّفِیْنَ

آیات: ۳۶

اللہ رحمٰن و رحیم کے نام سے

۱ تباہی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے،

۲ جو لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں۔

۳ اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو گھٹا کر دیتے ہیں۔

۴ کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ انہیں اٹھایا جائے گا؟ ۱؎

۵ ایک بڑے دن، ۲؎

۶ جس دن سب لوگ رب العالمین کے حضور کھڑے ہونگے۔ ۳؎

۷ (ان کا گمان صحیح) نہیں ۴؎۔ یقین جانو بدکاروں کا نامۂ عمل سجّین میں ہوگا۔

۸ اور تمہیں کیا معلوم کہ سجّین کیا ہے؟

۹ وہ ایک ریکارڈ آفس ہے۔ ۵؎

۱۰ تباہی ہے اس دن، انکار کرنے والوں کے لئے !

۱۱ جو روزِ جزا کا انکار کرتے ہیں۔

۱۲ اور اس کا انکار وہی لوگ کرتے ہیں، جو حد سے گذرنے والے ۶؎ گنہگار ہوتے ہیں۔ ۷؎

۱۳ ایسے شخص کو جب ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں تو وہ کہتا ہے کہ یہ تو اگلے لوگوں کے فسانے ہیں۔ ۸؎

۱۴ نہیں ۹؎، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال (بد) کا زنگ چڑھ گیا ہے۔ ۱۰؎

۱۵ ہرگز نہیں ۱۱؎۔ اس دن وہ اپنے رب سے دور رکھے جائیں گے۔ ۱۲؎

۱۶ پھر وہ جہنم میں داخل ہوں گے۔

۱؎ ان ابتدائی آیات میں ناپ تول میں کمی کرنے والوں پر سخت گرفت کی گئی ہے۔ یہ گرفت اگرچہ کہ ڈنڈی مارنے اور ناپ گھٹا کر دینے پر کی گئی ہے، تاہم اس کے مفہوم میں لین دین کے معاملہ میں کی جانے والی ہر قسم کی بد دیانتی اور فریب دہی شامل ہے۔ مثال کے طور پر اشیاء میں ملاوٹ کرنے (Adulteration) پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ کیوں کہ ملاوٹ کی صورت میں اصل شئے کو مقدار سے کم دیا جاتا ہے۔ چنانچہ دودھ میں پانی ملانے کا مطلب خالص دودھ کی مقدار کو گھٹا دینا ہے۔ اور چونکہ گھٹا دینے کا یہ عمل خریدار سے چھپا کر کیا جاتا ہے اس لئے یہ فریب دہی بھی ہے اور خِسّت بھی۔

اس خرابی کی اصل وجہ قرآن نے یہ بتلائی ہے کہ ایسے لوگ خدا کے حضور پیشی کا کوئی تصور نہیں رکھتے۔ حالانکہ ان کا ضمیر خود اس بات کی گواہی دے رہا ہوتا ہے کہ وہ اپنے رب کے حضور جوابدہ ہیں۔ کیوں کہ اس مجرمانہ طرزِ عمل کو اختیار کرنے والے لوگ جب دوسروں سے لیتے ہیں تو ناپ بھر کر لیتے ہیں۔ اور کوئی شخص بھی اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اس کی آنکھوں میں دھول جھونک دی جائے، اور اس کو مقدار سے کم دیا جائے۔ بالفاظ دیگر انسانی فطرت عدل ہی کو پسند کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ ہر ایک کے ساتھ عدل کا معاملہ کیا جائے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کا خالق عدل ہی کو پسند کرتا ہے۔ لہٰذا جو لوگ دوسروں کے ساتھ معاملہ کرتے وقت عدل کی خلاف ورزی کرتے ہیں، وہ دراصل اپنے رب کی مرضی اور اس کے اس حکم کے خلاف کام کرتے ہیں، جو ان کی فطرت میں ودیعت ہوا ہے۔ پھر ان کا رب ان کی ان مجرمانہ حرکتوں پر گرفت کیوں نہیں کرے گا؟ کیا ڈنڈی مارنے والے اور انصاف کا ترازو قائم کرنے والے، دونوں یکساں ہو سکتے ہیں اور کیا دونوں کا انجام یکساں ہوگا؟ انسان کی فطرت اور اس کا وجدان اس کو یکساں تسلیم نہیں کرتا۔ یہیں سے قرآن کے بیان کی صداقت روشن ہو جاتی ہے کہ انسان کو ایک دن جی اٹھنا ہے۔ اور اپنے رب کے حضور اپنے طرزِ عمل کے سلسلہ میں جوابدہی کرنی ہے۔ اور اس کے مطابق جزا یا سزا پانا ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ انسان جب خدا کے حضور جوابدہی کا تصور نہیں رکھتا، تو اس کے لینے کے پیمانے اور ہوتے ہیں اور دینے کے اور۔ وہ نہ صرف اپنا حق پورا پورا وصول کرنا چاہتا ہے بلکہ چاہتا ہے کہ دوسروں کے حقوق پر بھی ڈاکہ ڈالے۔ اس ذہنیت کی اصلاح کا صحیح اور مؤثر ذریعہ خدا کے حضور جوابدہی کا تصور ہی ہے۔ اس لئے معاشی خرابیوں کو دور کرنے کا مسئلہ ہو یا سماجی بگاڑ کے سدھار کا مسئلہ، افراد میں یہ شعور بیدار کئے بغیر حقیقی اصلاح ممکن نہیں ہے۔

۲؎ مراد قیامت کا دن ہے، جو نہایت سخت ہوگا۔

۳؎ عدالت خداوندی میں حاضری کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ آدمی اس پر سے سرسری طور سے گذر جائے۔ بلکہ یہ نہایت سخت اور کٹھن مرحلہ ہوگا جو ہر شخص کو لازماً پیش آنا ہے۔ لہٰذا اگر وہ چاہتا ہے کہ سلامتی کے ساتھ اس مرحلہ سے گذر جائے، تو اسے اپنے دل و دماغ میں اس تصور کو بسانا ہوگا، اور اسی بنیاد پر زندگی گزارنا ہوگی۔

ذرا تصور کیجئے عدالتِ خداوندی کا، جب سارے انسان زندہ ہو کر میدان حشر میں جمع ہو چکے ہوں گے۔ فرمانروائے کائنات عدالت برپا فرمائے گا۔ ہر شخص کی اس کے حضور پیشی ہوگی اور اسے اپنی پوری زندگی کا حساب پیش کرنا ہوگا۔ فرشتے اس بات کے منتظر ہوں گے کہ کس کے حق میں کیا فیصلہ ہوتا ہے، تاکہ اس کا نفاذ عمل میں لائیں۔ اس وقت انسان بالکل بے بس ہوگا۔ اگر انسان آج اس بے بسی کا تصور کر لے تو خوفِ خداوندی سے کانپ اٹھے، اور اس کے اندر احساسِ ذمہ داری پیدا ہو جائے۔ حدیث نبوی میں قیامت کے موقف کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے:

یَومَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِیْنَ حَتّٰی یَغِیْبَ اَحَدُھُم فِیْ رَشْحِہٖ اِلٰی اَنْصَافِ اُذُنَیْہِ۔ (مسلم کتاب الجنۃ)

''جس روز لوگ رب العالمین کے حضور پیشی کے لئے کھڑے ہوں گے، تو وہ پسینہ میں اس طرح شرابور ہوں گے کہ بعض لوگوں کے کان کے نصف حصہ تک کا جسم پسینہ میں ڈوب رہا ہوگا۔''

اللہ اکبر! کیسا شدید مرحلہ ہوگا جس سے اللہ کے رسول نے انسان کو پیشگی باخبر کر دیا ہے! کاش کہ لوگ قیامت کے مؤقف کے تصور سے اپنے موقف پر نظر ثانی کرنے کے لئے تیار ہوتے!

۴۔ یعنی ان کا یہ گمان غلط ہے کہ نہ دوبارہ جی اٹھنا ہے اور نہ خدا کے حضور جوابدہی کرنا ہے۔

۵۔ ''سجّین'' سجن سے بنا ہے، جس کے معنیٰ قید خانہ کے ہیں۔ یہاں یہ لفظ قرآن نے اپنی اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اور اس کی خود ہی یہ تشریح کی ہے کہ وہ ''کتاب مرقوم'' ہے یعنی ''ریکارڈ آفس''۔

یہ عالمِ برزخ کی ایک بڑی حقیقت ہے جس سے انسان کو باخبر کیا گیا ہے۔ ہر ہر فرد کی عملی زندگی کا ریکارڈ تیار کرنے پر فرشتوں کو جو مامور کیا گیا ہے اس کا سلسلہ اس کی موت تک جاری رہتا ہے۔ موت کے بعد اس کا نامۂ عمل عالم برزخ میں منتقل ہوجاتا ہے۔ اگر وہ بدکار تھا تو اس کے نامۂ عمل کا اندراج ''سجّین'' نامی ریکارڈ آفس میں کیا جاتا ہے۔ اور اگر وہ نیکوکار تھا تو جیسا کہ آگے بیان ہوا ہے، اس کا اندراج ''علّیین'' میں ہوتا ہے۔ اس سے اصلاً یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ ہر ہر شخص کے نامۂ عمل کو اس کے مرنے کے بعد محفوظ رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے اہتمام کر رکھا ہے۔ اور قیامت کے دن اس کو کھول دیا جائے گا۔ اور اسی کی بنیاد پر عدالت خداوندی میں فیصلہ ہوگا۔

۶۔ حد سے گذر جانے والے سے مراد حدودِ بندگی سے تجاوز کرنے والے لوگ ہیں۔ یعنی جو اپنے کو اللہ کا بندہ نہیں سمجھتے بلکہ خود مختار سمجھ کر من مانی کرتے رہتے ہیں۔

۷۔ گنہگار سے مراد معصیت میں مبتلا ہونے والے لوگ ہیں۔ جب انسان خدا کا بندہ بن کر رہنے کے لئے تیار نہیں ہوتا، تو پھر اس کی پوری زندگی گناہ، برائی، جرم اور معصیت کی زندگی بن کر رہ جاتی ہے۔ ایسا شخص روزِ جزا کو کیوں ماننے لگے؟

۸۔ یعنی قرآن میں کافر قوموں پر عذابِ خداوندی کے جو تاریخی واقعات بیان ہوئے ہیں، ان سے سبق لینے کے بجائے یہ لوگ ان کو افسانے اور کہانیاں قرار دیتے ہیں۔ موجودہ زمانہ کے منکرین بھی اسی طرح کی الزام تراشی کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ سب کچھ ''دقیانوسیت'' ہے۔

۹۔ یہ تردید ہے منکرین کے اس الزام کی جو اوپر بیان ہوا۔

۱۰۔ یعنی وہ قرآن کے بارے میں اتنی غلط بات کہنے کی جسارت اس وجہ سے کر رہے ہیں کہ ان کے اعمالِ بد نے ان کو ڈھیٹ بنا دیا ہے۔ ورنہ ایک سلیم الفطرت انسان قرآن کے بارے میں ایسی نامعقول بات ہرگز نہیں کہہ سکتا۔

دل پر زنگ چڑھ جانے کی تشریح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمائی ہے:

اِنَّ الْعَبْدَ اذَا اَخطأَ خطِیْئَۃً نُکِتَتْ فِی قَلْبِهٖ نُکْتَۃٌ سَوْدَاءُ فَاِذَا هُوَ نَزَعَ وَاسْتَغْفَرَ وَ تَابَ صُقِلَ قَلْبُهٗ وَاِنْ عَادَ زِیْدَفِیْهَا حَتّٰی تَعْلُوَ قَلْبَهٗ وَهُوَ الران الذی ذِکر اللّٰہ کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ۔ (ترمذی ابواب التفسیر)

''بندہ جب کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ دھبّہ لگ جاتا ہے۔ اگر وہ اس سے باز آتا ہے اور استغفار اور توبہ کرتا ہے تو اس کا دل صاف ہوجاتا ہے۔ لیکن اگر وہ پھر گناہ کرتا ہے یہ دھبّہ بڑھ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ پورے دل پر چھا جاتا ہے۔ یہی وہ زنگ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے آیت کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ میں کیا ہے''۔

۱۱۔ یعنی ان کی یہ آرزو بھی باطل ہے کہ اگر آخرت برپا ہو ہی گئی تو ہمیں، جس طرح دنیا میں ''عزت کا مقام'' حاصل ہوا ہے، خدا کے ہاں بھی شرف باریابی حاصل ہوگا۔

۱۲؎ یعنی یہ لوگ خدا کے ہاں شرف باریابی کیا حاصل کر سکیں گے۔ انہیں تو اس روز اپنے رب سے دور رکھا جائے گا۔ وہ اس کی عنایات سے بھی محروم ہوں گے اور اس کی شان کے جلوے دیکھنے سے بھی۔

ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۷﴾

۱۷ اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی چیز ہے، جس کا تم انکار کرتے رہے ہو۔

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ﴿۱۸﴾

۱۸ (ان کا دعویٰ صحیح) نہیں ۱۳؎۔ یقیناً نیک کردار لوگوں کا نامۂ اعمال علیّین میں ہوگا۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ﴿۱۹﴾

۱۹ اور تمہیں کیا معلوم کہ علیّین کیا ہے؟

كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴿۲۰﴾

۲۰ وہ ایک ریکارڈ آفس ہے، ۱۴؎

يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۲۱﴾

۲۱ جہاں مقربین کی (بارگاہِ الٰہی میں) حضوری ہوتی ہے۔ ۱۵؎

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿۲۲﴾

۲۲ بے شک نیکوکار عیش میں ہوں گے،

عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ﴿۲۳﴾

۲۳ شاندار تختوں پر بیٹھے نظارہ کر رہے ہوں گے، ۱۶؎

تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ﴿۲۴﴾

۲۴ ان کے چہروں پر تم دیکھو گے کہ خوشحالی کی بشاشت جھلک رہی ہے۔ ۱۷؎

يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ﴿۲۵﴾

۲۵ ان کو ایسی شراب پلائی جائے گی جو خالص اور سربہ مہر ہوگی،

خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ۭ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ﴿۲۶﴾

۲۶ یہ مہر مشک کی ہوگی ۱۸؎۔ اور، رغبت کرنے والوں کو چاہئے کہ بڑھ چڑھ کر اس کی رغبت کریں۔ ۱۹؎

وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ﴿۲۷﴾

۲۷ اس شراب میں تسنیم کی آمیزش ہوگی، ۲۰؎

عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۲۸﴾

۲۸ یہ ایک چشمہ ہوگا، جسمیں سے مقرب (بندے) پئیں گے۔ ۲۱؎

اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ﴿۲۹﴾

۲۹ جو لوگ مجرم بنے ہوئے تھے، وہ اہل ایمان پر ہنسا کرتے تھے۔ ۲۲؎

وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ ﴿۳۰﴾

۳۰ اور جب ان کے پاس سے گذرتے، تو آنکھوں سے اشارہ کرتے۔ ۲۳؎

وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ﴿۳۱﴾

۳۱ اور جب اپنے گھر والوں میں لوٹتے تو خوش خوش لوٹتے۔ ۲۴؎

وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ لَضَاۗلُّوْنَ ﴿۳۲﴾

۳۲ اور جب انہیں دیکھتے تو کہتے کہ یہ بہکے ہوئے لوگ ہیں، ۲۵؎

وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ ﴿۳۳﴾

۳۳ حالانکہ وہ ان پر نگراں بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔ ۲۶؎

فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ﴿۳۴﴾

۳۴ تو آج اہل ایمان کفار پر ہنسیں گے، ۲۷؎

عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ﴿۳۵﴾

۳۵ تختوں پر بیٹھے (ان کا حال) دیکھ رہے ہوں گے۔ ۲۸؎

هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾

۳۶ مل گیا نا کافروں کو ان کے کئے کا بدلہ!

۱۳؎ یعنی ان کا یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ اللہ کے ہاں نیک و بد میں کوئی تمیز نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے بدکاروں کا نامۂ عمل الگ محفوظ رکھنے کے لئے الگ الگ ریکارڈ آفس قائم کر رکھے ہیں۔

۱۴؎ ''عِلّیّین'' کے لفظی معنیٰ اعلیٰ مقامات کے ہیں۔ یہاں اس لفظ کو قرآن نے اپنی خاص اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اور اس کی تشریح خود ہی کر دی ہے کہ ''وہ کتابِ مرقوم'' ہے۔ یعنی وہ ایک ''ریکاڈ آفس'' ہے جہاں نیک لوگوں کے نامۂ عمل کا اندراج ہوتا ہے۔ یہ اندراج ان کے مرنے کے بعد ہوتا ہے اور یہ عالم برزخ کا ریکارڈ آفس ہے۔

۱۵؎ مراد مقرب فرشتوں کی حضوری ہے۔ نیکوکاروں کے ریکارڈ آفس پر مقرب فرشتوں کی حضوری گویا مقرب فرشتوں کی طرف سے نیکوکاروں کے حق میں خراجِ تحسین ہے۔ اور یہ بہت بڑا شرف اور بہت بڑا اعزاز ہے، جو عالم برزخ میں نیک بندوں کو حاصل ہوتا ہے۔

۱۶؎ یعنی شاہانہ انداز میں شاندار تخت پر بیٹھے، جنت کی وسیع اور پُر بہار فضاء میں اپنے رب کی نعمتوں، اور اس کی شان کے جلوے دیکھ رہے ہوں گے۔

۱۷؎ نیک کردار لوگوں کو جنت میں جو زندگی میسر آئے گی، وہ ایسی آسائش کی ہوگی کہ ان کے چہرے ہمیشہ تر و تازہ اور شگفتہ ہی رہیں گے۔

۱۸؎ اس میں طنز ہے دنیا کی شراب پر جو گندہ ہوتی ہے، اور ڈھکن کھلتے ہی اس کی سرانڈ سے دماغ پھرنے لگتا ہے۔ اس کے برخلاف جنت کی شراب کی خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ ہر قسم کی آلودگی سے پاک مئے ناب ہوگی۔ اور وہ جن بوتلوں یا برتنوں میں بند ہوگی ان پر مشک کی مہر لگی ہوگی۔ اس لئے اس کی خوشبو سے دماغ معطر ہوگا اور پینے میں لذت محسوس ہوگی۔

۱۹؎ ''اس کی رغبت کریں'' سے مراد جنت کی نعمتوں کی رغبت کرنا ہے جن کا ذکر اوپر ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی کو ادنیٰ کے بجائے اعلیٰ چیز کا، اور ختم ہونے والی چیز کے مقابلہ میں ہمیشہ باقی رہنے والی چیز کا انتخاب کرنا چاہئے۔ اور اس لحاظ سے آدمی غور کرے تو دنیا کا عیش اور اس کی لذتیں، آخرت کے عیش اور اس کی لذتوں کے مقابلہ میں بالکل بے وقعت اور بے حقیقت قرار پائیں گی۔ اور دانشمندی کا تقاضہ یہی ہوگا کہ آدمی ان کا حریص بننے اور مادہ پرستی میں غرق ہونے کے بجائے اُخروی نعمتوں کا طلبگار بنے۔ اور اس میدان میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرے۔

قرآن نے یہاں جنت کی نعمتوں کے طلب گار بننے کی جو ترغیب دی ہے، اس سے ان لوگوں کے خیال کی تردید ہوتی ہے، جو ''ادب برائے ادب'' کے طرز پر ''نیکی برائے نیکی'' (Virtue for the sake of virtue) کا نظریہ پیش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک جنت اور اس کی نعمتوں کی تمنا کرتے ہوئے نیکی کرنا ایک فروتر بات ہے۔ بظاہر یہ بات اونچی سطح کی معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقتاً یہ محض تخیل کی پرواز ہے۔ اس کو نہ انسان کی نفسیات سے کوئی مناسبت ہے، اور نہ ہی یہ کوئی قابل عمل بات ہے۔ نیز یہ قرآن و سنت کے نصوصِ صریحہ کے بھی خلاف ہے۔ اسلام کی تعلیم نہ تفلسف کی ہے اور نہ تخیلات کی دنیا میں پرواز کرنے کی۔ بلکہ اس کی تعلیمات واقعیت پسندانہ، انسانی نفسیات کے ٹھیک ٹھیک مطابق اور اس کو عمل پر آمادہ کرنے والی ہیں۔ وہ شاعری کرنے نہیں آیا ہے، بلکہ مٹی سے بنے ہوئے انسان کو جنت کا باشندہ بنانے کے لئے آیا ہے۔

۲۰؎ تسنیم کے معنیٰ بلند کرنے کے ہیں۔ یہ جنت کے ایک چشمہ کا نام ہے۔ اور غالباً یہ نام اس کی اس خصوصیت کے بنا پر رکھا گیا ہے کہ اس میں سے نوش کرنے والوں کی رفعت میں مزید اضافہ ہوگا۔

۲۱؎ تسنیم اہل جنت کا سب سے اعلیٰ مشروب ہوگا۔ نیک لوگوں کو جو شراب پلائی جائے گی اس میں اس اعلیٰ مشروب کی آمیزش ہوگی، تاکہ اس کے کیف میں اضافہ ہو جائے۔ لیکن جو لوگ مقربین کے درجہ کے ہوں گے وہ براہ راست اس چشمہ سے نوش کریں گے۔ گویا لطف اندوزی اور کیف و سرور

میں ان کا حصہ اتنا ہی وافر ہوگا، جتنا کہ وافر حصہ ان کا ایمان، عمل صالح اور اللہ کے لئے قربانیاں دینے کے معاملہ میں رہا ہے۔

۲۲۔ یعنی وہ اہل ایمان کا مذاق اڑاتے اور ان پر پھبتیاں کستے۔

اہل ایمان کا مذاق اڑانے کا سلسلہ تو موجودہ زمانہ میں بھی جاری ہے۔ البتہ کچھ نئے فقروں کے ساتھ۔۔ چنانچہ آج کے ''موڈرن'' لوگ اسلام کی صحیح پیروی کرنے والوں پر ملائیت (Orthodoxy) اور ''قدامت پسندی'' (Conservatism) کے فقرے چست کرتے ہیں۔

۲۳۔ یعنی انہوں نے اہل ایمان کی تذلیل وتحقیر میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ یہاں تک کہ جب ان کا گزر اہل ایمان کے پاس سے ہوتا تو وہ آپس میں ان کے خلاف کن انکھیوں سے اشارے کرتے۔

۲۴۔ ان آیات میں مخالفین کے اس رویہ کی تصویر کھینچی گئی ہے، جو اہل ایمان کے خلاف وہ اختیار کئے ہوئے تھے۔ جب وہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے بعد گھر واپس لوٹتے، تو بجائے اس کے کہ انہیں اپنی ان حرکتوں پر ندامت ہو، وہ خوش ہوتے اور فخریہ انداز میں اس کا ذکر اپنے گھر والوں سے کرتے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو لوگ حق کو ٹھکرا دیتے ہیں، ان کی نفسیات اہل حق کے بارے میں کیا ہوتی ہیں۔

۲۵۔ موجودہ زمانہ میں جو لوگ اسلام کو دیگر مذاہب پر قیاس کر کے اسے بھی افیون قرار دیتے ہیں، وہ قرآن کی دعوت کو لے کر اٹھنے والوں کے بارے میں یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ عقل کے کورے ہیں۔

۲۶۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے اعمال کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا نہ کہ دوسروں کے اعمال کا۔ لیکن یہ اپنی ذات کو بھلا کر اہل ایمان کے پیچھے پڑ گئے کہ انہیں اذیت دے دیکر اپنی بات زبردستی ان سے منوائیں۔ گویا خدا نے انہیں دنیا میں اس لئے نہیں بھیجا تھا کہ وہ اپنا صالح ہونا ثابت کر دکھائیں، بلکہ اس لئے بھیجا تھا کہ داروغہ بن کر اہل ایمان کی خوب خبر لیں۔

۲۷۔ دنیا میں کفار اہل ایمان پر ہنستے رہے ہیں۔ لیکن آخرت میں اہل ایمان کفار پر ہنسیں گے۔ اس طرح ان کو اپنی اس حرکت کا ٹھیک ٹھیک بدلہ ملے گا۔ اور چونکہ کفار پر دنیا میں اللہ کی حجت قائم ہو چکی تھی، اس کے باوجود انہوں نے قبول حق کی راہ اختیار نہیں کی، بلکہ سرکش بنکر حق کی مخالفت کرتے رہے اور اہلِ ایمان کے دشمن بنکر رہے۔ اس لئے وہ آخرت میں کسی ہمدردی کے مستحق نہیں ہونگے۔ اگر وہ کسی ہمدردی کے مستحق ہوتے تو اللہ تعالیٰ خود ان پر رحم فرماتا۔ اس بناء پر اہل ایمان کا ان کے حال پر ہنسنا بالکل صحیح اور برمحل ہوگا۔

۲۸۔ یعنی جہنم میں کفار کا جو حال ہو رہا ہوگا اسے اہل ایمان جنت میں اپنے تخت پر بیٹھے بیٹھے ہی دیکھ رہے ہوں گے۔ قرآن کی اس بات کو بھی آج کے سائنسی دور میں سمجھنا کچھ مشکل نہیں رہا۔ جب کہ ہم اپنے گھروں ہی میں بیٹھے بیٹھے میلوں دور کی چیزیں ٹیلیویژن پر دیکھ لیتے ہیں۔

۸۴۔ الانشقاق

نام اس سورہ کے آغاز میں قیامت کے دن آسمان کے پھٹنے کی خبر دی گئی ہے۔اس مناسبت سے اس سورہ کا نام ''الانشقاق ہے''۔یعنی وہ سورہ جس میں (آسمان) کے پھٹنے کا ذکر ہوا ہے۔

زمانۂ نزول یہ سورہ مکی ہے۔اور مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہوگی، جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کا آغاز فرمایا تھا۔اور قیامت سے لوگوں کو خبردار کررہے تھے۔

مرکزی مضمون یوم جزا اور اچھا اور برُا انجام ہے۔

سابق سورہ میں بیان کیا گیا تھا کہ انسان کا نامۂ اعمال اس کے مرنے کے بعد عالم برزخ میں، ایک ریکارڈ آفس (سجّین یا علّیین) میں محفوظ رکھا جاتا ہے۔اس سورہ میں اس بات سے باخبر کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن پیشی سے پہلے، ہر شخص کو اس کا نامۂ اعمال اس کے ہاتھ میں دے دیا جائے گا۔

نظمِ کلام آیت ۱ تا ۵ میں اس انقلاب کا مجملاً ذکر ہے، جو قیامت کے ظاہر ہوتے ہی آسمان وزمین میں برپا ہوگا۔

آیت ۶ تا ۱۵ میں انسان کے عدالتِ خداوندی کی طرف بڑھنے، نامۂ اعمال ہاتھ میں دیئے جانے اور اپنے انجام کو پہنچنے کا ذکر ہے۔

آیت ۱۶ تا ۱۹ میں آثارِ کائنات سے اس بات پر استدلال کیا گیا ہے کہ انسان کو موت کے بعد مختلف مراحل سے گذرنا ہوگا۔

آیت ۲۰ تا ۲۵ میں ان لوگوں کو وعید سنائی گئی ہے، جو قرآن کو سن کر خدا کے آگے جھکتے نہیں ہیں، بلکہ اس کی تکذیب کرتے ہیں۔اور ان لوگوں کو کبھی نہ ختم ہونے والے اجر کی خوشخبری دی گئی ہے، جو ایمان لاکر عملِ صالح کرتے ہیں۔

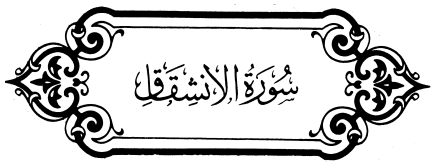

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۙ﴿۱﴾
وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۙ﴿۲﴾

وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۙ﴿۳﴾
وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ ۙ﴿۴﴾
وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۙ﴿۵﴾

يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ۚ﴿۶﴾

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِىَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۙ﴿۷﴾
فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۙ﴿۸﴾
وَّيَنْقَلِبُ اِلٰۤى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۙ﴿۹﴾
وَاَمَّا مَنْ اُوْتِىَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۙ﴿۱۰﴾
فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۙ﴿۱۱﴾
وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا ؕ﴿۱۲﴾
اِنَّهٗ كَانَ فِىْۤ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ؕ﴿۱۳﴾
اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ ۚ﴿۱۴﴾
بَلٰۤى ۚ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا ؕ﴿۱۵﴾
فَلَاۤ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۙ﴿۱۶﴾
وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۙ﴿۱۷﴾

۸۴۔ سُوْرَةُ الْاِنْشِقَاقِ

آیات:۲۵

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ جب آسمان پھٹ جائے گا، ۱؎

۲ اور اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گا، اور اس کو لازماً تعمیل کرنا چاہئے، ۲؎

۳ اور جب زمین پھیلا دی جائے گی۔ ۳؎

۴ اور جو کچھ اس کے اندر ہے، اُسے اُگل کر خالی ہو جائے گی، ۴؎

۵ اور اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گی۔ اور اس کو لازماً تعمیل کرنا چاہئے۔ ۵؎

۶ اے انسان! تو کشاں کشاں اپنے رب ہی کی طرف جا رہا ہے۔ اور بالآخر اس سے ملنے والا ہے۔ ۶؎

۷ تو جس کا نامۂ عمل اس کے داہنے ہاتھ میں دیا گیا، ۷؎

۸ اس سے آسان حساب لیا جائے گا، ۸؎

۹ اور وہ اپنے متعلقین ۹؎ کے پاس خوش خوش لوٹے گا۔

۱۰ اور جس کا نامۂ عمل اس کی پیٹھ کے پیچھے دیا گیا، ۱۰؎

۱۱ وہ موت کو پکارے گا،

۱۲ اور بھڑکتی آگ میں داخل ہوگا۔

۱۳ وہ اپنے گھر والوں میں مست تھا۔ ۱۱؎

۱۴ اس نے سمجھ رکھا تھا کہ اس کو کبھی لوٹنا نہیں ہے۔ ۱۲؎

۱۵ کیوں نہیں! اس کا رب تو اس کو خوب دیکھ رہا تھا۔

۱۶ نہیں ۱۳؎، میں قسم کھاتا ہوں ۱۴؎ شفق کی، ۱۵؎

۱۷ اور رات کی، اور جو کچھ وہ اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے، اس کی، ۱۶؎

۱؎ یہ خیال کرنا صحیح نہیں کہ آسمان محض حدِ نظر کا نام ہے۔ اور اس کی کوئی مادّی حقیقت نہیں۔ اور جب اس کی کوئی مادّی حقیقت نہیں، تو اس کے پھٹنے کا سوال پیدا ہی کہاں ہوتا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ سائنس کے نام پر یہ بات ذہن کو محض مرعوب کرنے کیلئے کہی جاتی ہے۔ ورنہ یہ نہ کوئی سائنسی اکتشاف ہے اور نہ اس خیال کیلئے کوئی ٹھوس بنیاد ہی ہے۔ جہاں تک موجودہ سائنس کا تعلق ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس کی رسائی ابھی آسمان تک ہو ہی نہیں سکی ہے۔ وہ تو ابھی ستاروں کی دنیا ہی میں چکر لگا رہی ہے۔ وہ کائنات کی پہنائیوں کو، ناپنے سے بالکل قاصر ہے۔ علم فلکیات کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ سائنسداں ابھی کائنات کی وسعت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکے ہیں۔ چنانچہ ماہر فلکیات W. Bartky اپنی کتاب میں کائنات کی حیرت انگیز وسعت کو بیان کرنے کے بعد صاف صاف اعتراف کرتا ہے کہ:

"What lies beyond no man knows. whether the stars continue without end or whether the universe has a definite boundary remains, and perhaps will always remain, a topic for speculative argument "(Highlights of Astronomy p. 260)

اور جب سائنس یہ بتانے سے اپنے کو عاجز پاتی ہے کہ اس کائنات کی کوئی سرحد ہے یا نہیں؟ تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ کائنات کے ''حدودِ اربعہ'' ابھی معلوم نہیں کر سکی ہے۔ ایسی صورت میں یہ دعویٰ کس طرح کیا جا سکتا ہے کہ آسمان کا کوئی مادّی وجود ہے ہی نہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ فلکیات (Astronomy) کی کتابوں میں صرف ان باتوں کے بیان کرنے پر اکتفاء نہیں کیا جاتا، جو سائنسی تجربات و مشاہدات کے ذریعہ علم میں آئی ہیں۔ بلکہ ان کے ساتھ قیاسی باتوں کو بھی جوڑ دیا جاتا ہے۔ اور لوگ اس پورے ''مخلوطے'' کو ''سائنس'' کے نام سے پیش کر کے غلط باتوں کو بھی صحیح باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔

آسمان کے بارے میں قرآن کا بیان بہت واضح ہے۔ مثلاً یہ کہ اس نے آسمان کو اپنے ہاتھ سے بنایا۔ (وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ) (الذاریات۔ ۴۷) اسے بلند کیا۔ (وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا۔ (الرحمٰن: ۷) اسے محفوظ چھت بنایا۔ (سَقْفاً مَحْفُوظاً) (انبیاء۔ ۳۲) اسے ستاروں سے مزین کیا۔ (وَزَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ) (حٰم سجدہ۔ ۱۲) ساتھ ہی قرآن خبر دیتا ہے کہ قیامت کے دن آسمان پھٹ جائے گا (إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ) (انشقاق۔ ۱) اور اس میں دروازے ہی دروازے ہو جائیں گے۔ (فَكَانَتْ أَبْوَاباً) (النباء۔ ۱۹)

قرآن کے اس بیان سے آسمان کے ایک مادّی شئے ہونے کا ہی تصور پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی کوئی ایسی تاویل کرنا صحیح نہ ہوگا، جو اس کے ظاہری الفاظ سے متبادر ہونے والے مفہوم کے بالکل خلاف ہو۔ (مزید تشریح کیلئے ملاحظہ ہو سورۂ انفطار نوٹ ۱؎)

۲؎ یعنی یہ خیال نہ کرو کہ آسمان خدا کے حکم سے سرتابی کر سکتا ہے۔ نہیں، بلکہ لازماً اس کو حکم خداوندی کی تعمیل کرنا ہے۔ کیوں کہ وہ اس کا خالق و مالک ہے۔ اور اسکی فرمانروائی اس پر پوری طرح قائم ہے۔ لہٰذا جب قیامت کے دن وہ اسے پھٹنے کا حکم دے گا، تو وہ یہ حکم سنتے ہی پاش پاش ہو جائے گا۔

۳؎ یعنی زمین اپنی موجودہ شکل میں باقی نہیں رہے گی۔ بلکہ اسے تان کر وسیع کر دیا جائے گا، تاکہ وہ بہت بڑے ہموار میدان کی شکل اختیار کر لے، جس پر خدا کے حضور پیشی کے لئے پوری نوعِ انسانی کے افراد کو جگہ مل جائے، جو اول روز سے قیامت تک پیدا ہوتے رہے ہیں۔

۴؎ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ زمین مُردوں کو اُگل کر ان کے بوجھ سے اس طرح خالی ہو جائے گی، جیسے حاملہ عورت بچہ جننے کے بعد بوجھ سے فارغ ہوتی ہے۔ گویا زمین مُردوں سے بوجھل ہو رہی ہے اور ان کو اُگلنے ہی کو ہے۔

۵؎ یعنی زمین بھی اپنے رب کے حکم کی تعمیل اشارہ پاتے ہی کرے گی۔ قیامت کے واقع ہونے میں کوئی چیز بھی رکاوٹ پیدا نہیں کر سکتی۔

۶؎ یعنی انسان کو اپنے سفرِ زندگی کا شعور ہو یا نہ ہو، وہ جا رہا ہے اپنے رب ہی کی طرف، تاکہ عدالتِ خداوندی میں حاضر ہو۔ جس طرح زمین کے

ساتھ ہم بھی گردش کرتے رہتے ہیں خواہ ہم گردش کرنا چاہیں یا نہ چاہیں۔اور خواہ ہمیں اس گردش کا شعور ہو یا نہ ہو۔اسی طرح زندگی کا یہ سفینہ ہمیں لئے ہوئے رب العالمین کی عدالت کی طرف رواں ہے۔اور ہماری آخری منزل آخرت ہے۔لیکن نادان لوگ دنیا ہی کو اپنی منزل سمجھتے ہیں۔اس لئے انہیں آخرت کی کوئی فکر لاحق نہیں ہوتی۔

اربوں انسان دنیا میں پیدا ہوتے ہیں اور مرتے ہیں۔مگر کتنے ہیں جنہوں نے اس اہم ترین سوال پر سنجیدگی سے غور کیا ہو؟ کہ ہمارے سفرِ زندگی کا آغاز کہاں سے ہوا ہے اور سفر کی آخری منزل کیا ہے؟ اگر ہمیں راستہ میں کوئی شخص ملے اور ہم اس سے پوچھیں کہ تم کہاں سے آرہے ہو؟ اور وہ جواب دے کہ مجھے نہیں معلوم، اور اس کے بعد ہمارے یہ سوال کرنے پر کہ تم کہاں جارہے ہو؟ وہ یہ جواب دے کہ مجھے نہیں معلوم۔تو کیا اس کے اس جواب پر ہمیں تعجب نہ ہوگا! اور کیا ہم اسے نادان نہیں کہیں گے؟ مگر دنیا میں بے شمار انسان ایسے ہیں جن سے ان کے سفرِ زندگی کے بارے میں سوال کیجئے تو یہی جواب ملے گا کہ ہمیں نہ اس سفر کی ابتداء معلوم ہے اور نہ انتہا، نہ آغاز کا ہمیں کچھ پتہ ہے اور نہ انجام کا۔اپنی منزل متعین کئے بغیر ہم اپنی زندگی کا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔کیسے نادان ہیں یہ لوگ جو انجام سے بے پروا ہو کر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔کاش انہیں شعور ہوتا کہ وہ اسی طرح عدالت خداوندی کی طرف کھینچے چلے جارہے ہیں، جس طرح کہ سوئی مقناطیس کی طرف کھینچی جاتی ہے۔

۷۔ اللہ تعالیٰ نے داہنے ہاتھ کو یہ امتیاز بخشا ہے کہ وہ خیر کی علامت قرار پایا۔چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو آداب سکھائے ہیں ان میں یہ بات بھی شامل ہے کہ تمام اچھے کام، مثلاً۔۔۔۔۔۔کھانا، پینا، وضو کرنا، خیرات کرنا وغیرہ اپنے داہنے ہاتھ سے انجام دیئے جائیں۔اللہ تعالیٰ کے بخشے ہوئے اسی شرف کی بنا پر نیکوکاروں کا داہنا ہاتھ قیامت کے دن اس بات کا اہل ہوگا کہ ان کا نامۂ اعمال ان کے اس ہاتھ میں دیا جائے۔

۸۔ نیکوکاروں سے آسان حساب لیا جائے گا!

آسان حساب سے مراد جیسا کہ نبی ﷺ نے تشریح فرمائی ہے، خدا کے حضور جوابدہی کے لئے صرف پیشی ہے۔اس پیشی کے موقع پر سخت باز پرس نہیں ہوگی، بلکہ اللہ تعالیٰ درگذر فرمائے گا۔حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''قیامت کے دن جس سے حساب لیا گیا وہ عذاب میں پڑ گیا۔حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا! اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے فَسَوفَ حَاسَبُ حِسَاباً يَّسِيرًا (اس سے آسان حساب لیا جائے گا) فرمایا اس کا مطلب سخت باز پرس کرنا نہیں ہے۔بلکہ صرف پیشی ہے۔جس سے قیامت کے دن سخت باز پُرس کی گئی وہ عذاب میں مبتلا ہوا۔'' (مسلم کتاب الجنۃ)

۹۔ اپنے متعلقین سے مراد اس کے اہل وعیال ہیں، جو صاحب ایمان ہوں گے اور جن کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ نے درگذر کا معاملہ کیا ہوگا۔وہ جنت میں ایک ساتھ جمع ہونگے اور انہیں ایک دوسرے کی رفاقت میسر آئیگی۔نیز اس مقصد کیلئے ان میں سے کسی کا درجہ گھٹایا نہیں جائے گا بلکہ بلند کر دیا جائے گا۔(ملاحظہ ہو سورۂ طور آیت ۲۱)

۱۰۔ یہ ان لوگوں کا انجام بیان ہو رہا ہے، جو خدا کے حضور پیشی پر یقین نہیں رکھتے۔اور اُس سے بغاوت کی بنیاد پر زندگی گذارتے ہیں۔ایسے لوگ عدالت خداوندی میں مجرم کی حیثیت سے پیش ہوں گے۔اس لئے ان کا نامۂ عمل پیچھے کی طرف سے ان کے بائیں ہاتھ میں پکڑا دیا جائے گا۔ انہوں نے کتاب الٰہی کو پسِ پشت ڈال دیا تھا اس لئے بجا طور پر وہ اس کے مستحق ہوں گے کہ ان کا نامۂ عمل انہیں پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائے۔

۱۱۔ یعنی اپنی اور اپنے بال بچوں کی عاقبت سے بے پروا ہو کر، اپنی اور ان کی دنیا بنانے ہی میں مست تھا۔

۱۲۔ یعنی جب خدا اسے دیکھ رہا تھا تو وہ اپنے حضور پیشی کے لئے کیسے نہیں بلاتا؟ اس کے بصیر ہونے کی صفت اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ وہ اپنے

بندوں کو اپنے حضور جوابدہی کے لئے بلائے، اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ان کو مرنے کے بعد اٹھائے۔

۱۳؎ یہ تردید ہے منکرین کے اس خیال کی کہ مرنے کے بعد نہ پھر زندہ ہونا ہے اور نہ خدا کی طرف لوٹنا ہے۔

۱۴؎ قسم کھانے کا مطلب ان چیزوں کو، جن کی قسم کھائی گئی ہے بطور دلیل یا شہادت کے پیش کرنا ہے۔ مزید تشریح کے لئے ملاحظہ ہو سورہ تکویر نوٹ ۱۴؎۔

۱۵؎ شفق اس سرخی کو کہتے ہیں جو سورج کے غروب ہونے کے بعد آسمان پر ظاہر ہوتی ہے۔

۱۶؎ سمیٹنے سے مراد رات کا اپنے دامن میں ستاروں کو سمیٹ لینا ہے۔

وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ﴿۱۸﴾

۱۸ اور چاند کی جب وہ مہہ کامل ہوجاتا ہے،

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴿۱۹﴾

۱۹ کہ تم کو لازماً ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلہ میں پہنچنا ہے۔ ۱۷؎

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰﴾

۲۰ پھر ان لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ ایمان نہیں لاتے، ۱۸؎

وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ ﴿۲۱﴾ ۩

۲۱ اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے، تو سجدہ نہیں کرتے۔ ۱۹؎

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۲﴾

۲۲ بلکہ یہ کافر، اُلٹا جھٹلا رہے ہیں۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ ﴿۲۳﴾

۲۳ اور یہ لوگ جو کچھ چھپا رہے ہیں، اسے اللہ خوب جانتا ہے۔ ۲۰؎

فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۴﴾

۲۴ تو تم ان کو ایک دردناک عذاب کی خوشخبری سُنادو، ۲۱؎

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ﴿۲۵﴾

۲۵ البتہ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے، ان کے لئے ایسا اجر ہے، جو کبھی ختم نہ ہوگا۔ ۲۲؎

۱۷؎ یہ ہے وہ بات جس کی تائید میں آثار کائنات کے کچھ احوال کو پیش کیا گیا ہے۔ بالفاظِ دیگر انسان کو ان احوال پر اس پہلو سے غور وفکر کی دعوت دی گئی ہے کہ ان کے مشاہدہ سے قرآن کے اس بیان کی تائید ہوتی ہے یا نہیں، کہ انسان کو لازماً ایک ایسے مرحلہ سے دوچار ہونا ہے، جہاں پہنچ کر اُسے اپنے رب کے سامنے اپنے طرزِ عمل کے بارے میں جوابدہی کرنا ہوگی۔

سورج کے غروب ہوتے ہی شفق کی سُرخی کا نمودار ہونا، دن کے رخصت ہوتے ہی رات کا اپنی بزم کو ستاروں سے آراستہ کرنا اور چاند کا ہلال سے بتدریج بدر کامل بن جانا، اس بات کا مکمل ثبوت ہے کہ اس کائنات میں تدریج پائی جاتی ہے۔ اور اس کے خالق نے مرحلے مقرر کئے ہیں۔ چنانچہ چاند مرحلہ بہ مرحلہ گذر کر ہی کامل بن جاتا ہے۔ پھر اس نے انسان کے لئے جس کی خاطر اس بزم کو سجایا گیا ہے، آگے کے مراحل کیسے نہیں رکھے ہوں گے۔ اور دنیوی زندگی کے اس ایک مرحلہ ہی میں اس کا خاتمہ کس طرح ہوجائے گا؟ پس قرآن یہ جو خبر پیغمبر کی زبانی سنا رہا ہے کہ انسان کو موت کے بعد پھر زندگی کے مرحلہ میں داخل ہونا ہے اور پھر اپنے رب کے حضور پیشی کے مرحلہ سے لازماً دوچار ہونا ہے، اور ان مرحلوں سے گذر کر اپنی آخری منزل جنت یا دوزخ میں پہنچ کر رہنا ہے، تو اس کی پوری پوری تائید آثارِ کائنات کے ان احوال سے ہوتی ہے جن کا ذِکر اوپر ہوا۔ اگر انسان اس پہلو سے ان احوال کا مشاہدہ کرے تو اس کی فکر ونظر کے زاویئے بدل جائیں۔

۱۸؎ یعنی لوگوں کا حال عجیب ہے کہ ان واضح شہادتوں کے بعد بھی، یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ انسان کو جواب دہی کے مرحلہ سے دوچار ہونا ہے۔ بلکہ اپنے اس خیال پر مصر ہیں کہ زندگی اسی دنیا تک ہے اور مرنے کے بعد کوئی مرحلہ پیش آنا نہیں ہے۔

۱۹؎ یعنی ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ قرآن کا یہ حقیقت افروز بیان سن کر وہ اس کی صداقت کا اعتراف کرتے۔ اور اس کی عظمت سے متاثر ہوکر خدا کے حضور سجدہ ریز ہوتے، لیکن انہوں نے اس کے برخلاف جھٹلانے اور اکڑنے کا رویہ اختیار کر رکھا ہے۔

اس مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سجدہ کرنا ثابت ہے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی اور آپ نے اس مقام پر سجدہ کیا۔ اسلئے میں مرتے دم تک یہ سجدہ کرتا رہوں گا۔ (مسلم)

۲۰؎ یعنی حق سے عناد اور اسلام دشمنی کے جذبات اور بے قید اور مفاد پرستانہ زندگی گذارنے کی خواہش، جس کو وہ اپنے سینہ میں چھپائے ہوئے ہیں، اللہ کو اس کا بخوبی علم ہے۔

۲۱؎ عذاب کی خبر کو خوشخبری سے تعبیر کرنے میں ایک لطیف طنز ہے۔ کہ جب تم جنت کی خوشخبری سننے اور اپنے کو اس کا مستحق بنانے کے لئے تیار نہیں ہو، تو پھر جہنم ہی کی خوشخبری سُن لو۔

۲۲؎ یعنی نیکوکاروں کو جو اجر آخرت میں ملے گا وہ وقتی اور عارضی نہ ہوگا۔ بلکہ مستقل اور دائمی ہوگا، جس کا سلسلہ کبھی منقطع ہونے والا نہیں۔ گویا یہ ایک بہتا ہوا دریا ہے جو ہمیشہ رواں دواں رہے گا۔

سورۂ البروج

۸۵۔ البروج

نام پہلی آیت میں برجوں والے آسمان کا ذکر ہوا ہے۔ اس مناسبت سے اس سورہ کا نام علامت کے طور پر ''البروج'' رکھا گیا ہے۔

زمانۂ نزول یہ سورہ مکی ہے اور مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت نازل ہوئی ہوگی، جب کفار ایمان لانے والوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنا رہے تھے۔ تاکہ وہ اپنے ایمان سے پھر جائیں۔

مرکزی مضمون قیامت اور جزا وسزا ہی ہے۔ البتہ اس کے اس پہلو کو خاص طور سے نمایاں کیا گیا ہے کہ وہ دن، مظلوم اہل ایمان کی دادرسی کا دن ہوگا۔ جو لوگ اہل ایمان کو محض ان کے ایمان لانے کی بنا پر ظلم وستم کا نشانہ بناتے ہیں، قیامت کے دن ان کی سخت پکڑ ہوگی۔ اور جو لوگ ایمان لاکر نیک عمل کرتے ہیں وہ کامیاب اور بامراد ہوں گے۔

نظمِ کلام آیت ۱ تا ۳ میں روز جزا کے قطعی ہونے کا دعویٰ، ایک ناقابل انکار حقیقت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

آیت ۴ تا ۱۱ میں ان لوگوں کو سخت عذاب کی وعید سنائی گئی ہے، جو مسلمانوں پر محض اس لئے ظلم ڈھاتے ہیں کہ وہ ایک خدا پر ایمان لائے ہیں۔ اور ان مسلمانوں کو جو ان مظالم کے باوجود، اپنے ایمان پر ثابت قدم رہیں گے، جنت کی بشارت سنائی گئی ہے۔

آیت ۱۲ تا ۱۶ میں ظالموں کو خبردار کیا گیا ہے کہ اللہ کی پکڑ بڑی سخت ہے۔ ساتھ ہی اللہ کی وہ صفات بیان کی گئی ہیں، جن سے اس کا خوف بھی پیدا ہوتا ہے۔ اور توبہ وانابت کی طرف رغبت بھی ہوتی ہے۔

آیت ۱۷ تا ۲۰ میں بعض سرکش اور ظالم قوموں کے عبرتناک انجام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، منکرین کو متنبہ کیا گیا ہے کہ خدا تمہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔

آیت ۲۱ اور ۲۲ خاتمۂ کلام ہے، جس میں واضح کیا گیا ہے کہ یہ قرآن، جو روزِ جزا کے آمد کی خبر دے رہا ہے، کیسی بلند پایہ کتاب ہے! اور اس کا سرچشمہ کتنا پاکیزہ اور محفوظ ہے۔ لہٰذا اس کی کوئی بات بھی غلط نہیں ہوسکتی۔ لازماً اس کی ہر بات اٹل ہے۔

سُوْرَةُ الْبُرُوْجِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ①
وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ②
وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ③
قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ④
النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ⑤
اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ⑥
وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ⑦
وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ⑧
الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى
كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ⑨
اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا
فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ⑩
اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ڛ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ ⑪
اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ⑫
اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ ⑬

۸۵۔ سورۃ البروج

آیات: ۲۲

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ قسم ہے ۱ے، برجوں والے آسمان کی، ۲ے

۲ اور اس دن کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے، ۳ے

۳ اور حاضر ہونے والے کی ۴ے، اور اس چیز کی جو حاضر کی جائے گی۔ ۵ے

۴ ہلاک ہوئے خندق والے، ۶ے

۵ جو خوب ایندھن والی آگ سے بھری تھی،

۶ جب وہ اس (آگ) کے پاس بیٹھے،

۷ جو کچھ اہل ایمان کے ساتھ کر رہے تھے، اس کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ۷ے

۸ اور ان کے ساتھ یہ تشدد محض اس وجہ سے کیا گیا کہ وہ اللہ پر ایمان لائے تھے ۸ے، جو زبردست ہے اور لائق ستائش بھی،

۹ جس کی بادشاہت ہے آسمانوں اور زمین میں ۹ے۔ اور اللہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔ ۱۰ے

۱۰ جن لوگوں نے مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں پر ظلم ڈھایا اور پھر توبہ نہیں کی، ان کیلئے لازماً جہنم کی سزا ہے اور ان کے لئے جلنے کا عذاب ہے۔ ۱۱ے

۱۱ جو لوگ ایمان لائے ۱۲ے۔ اور جنہوں نے نیک عمل کئے۔ یقیناً ان کیلئے باغ ہیں جن کے تلے نہریں رواں ہوں گی۔ یہ ہے بڑی کامیابی۔ ۱۳ے

۱۲ بیشک تمہارے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے۔ ۱۴ے

۱۳ وہی پہلی بار پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ پیدا کرے گا۔ ۱۵ے

۱؎ قسم کی تشریح کے لئے ملاحظہ ہو سورۂ تکویر نوٹ ۱۴؎۔

۲؎ بروج سے مراد ستاروں کی وہ بارہ فرضی شکلیں (Signsof zodiac) یا سورج کی بارہ منزلیں نہیں ہیں، جو قدیم علم ہیئت کی مخصوص اصطلاح ہے۔ بلکہ اس سے مراد روشن ستاروں کے جھرمٹ (Constellations) ہیں، جو آسمان کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ اور جنکی جلوہ ریزیاں انسان کو دعوت نظارہ دیتی ہیں ۔

''برج'' کے لغوی معنیٰ ظہور و نمائش اور قلعہ و محل کے ہیں۔ آسمان میں ستاروں کے جھرمٹ اس طرح درخشاں نظر آتے ہیں کہ گویا بلند محل ہیں جو سجائے گئے ہیں۔ ان کی اس طرح قلعہ بندی کی گئی ہے کہ جب شیطانی طاقتیں آسمان کی طرف پرواز کرنے لگتی ہیں، تو ان قلعوں سے ان پر شہاب ثاقب (Meteor) کے گولے داغے جاتے ہیں۔ اسلئے ستاروں کے ان جھرمٹ (Constellations) کو ''بروج'' کہا گیا ہے۔

یہاں برجوں والے آسمان کی قسم کھانے کا مطلب یہ ہے کہ آسمان میں درخشاں نظر آنے والے ستاروں کے یہ جھرمٹ، اس بات کی واضح شہادت دیتے ہیں کہ جس ہستی نے اس کائنات کی بزم سجائی ہے اس کے ہاں اندھیر نگری نہیں ہے۔ بلکہ وہ اپنی صفت جلال و جمال کے ساتھ اس کائنات پر حکومت کر رہا ہے۔ لہٰذا یہ ہو نہیں سکتا کہ جو لوگ اس کے وفادار بندوں پر ظلم ڈھاتے ہیں، ان سے باز پرس نہ ہو، اور اس کے وفادار مظلوم بندوں کو، جو اس کی خاطر ستائے گئے انعام و اکرام سے نہ نوازا جائے۔

شیطانی طاقتوں کی آسمان پر پرواز کو روکنے کے لئے شہاب ثاقب کے گولے برسائے جاتے ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حد سے تجاوز کرنے والوں کے لئے خدا کے ہاں سزا کا قانون ہے۔ پھر وہ سرکشوں کو سزا کیسے نہیں دے گا؟ گویا برجوں والے آسمان پر غور کرنے سے جزا و سزا کا تقاضا اُبھرتا ہے اور اس سے روزِ جزا کی تصدیق و تائید ہوتی ہے، جس کی خبر قرآن دے رہا ہے۔

۳؎ مراد قیامت کا دن ہے۔ اور اس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے اس لئے فرمایا ہے تاکہ وہ عدالت برپا کرے ۔ اور مؤمن و کافر، نیک و بد اور ظالم و مظلوم کے درمیان انصاف ہو۔

۴؎ مراد ہر وہ شخص ہے جو قیامت کے دن حاضر ہوگا۔

۵؎ مراد وہ چیزیں ہیں جو قیامت کے دن حاضر کی جائیں گی۔ اور وہ ہولناک مناظر ہیں جن کو ہر شخص دیکھ لے گا۔

یہاں یومِ موعود (جس دن کا کہ وعدہ ہے)، شاہد (حاضر ہونے والا)، اور مشہود (جو چیزیں کہ حاضر کی جائیں گی یا جو مناظر کہ سامنے لائے جائیں گے) کی قسمیں، کلام کو مؤکد کرنے اور ان باتوں کا یقین پیدا کرنے کے لئے کھائی گئی ہیں۔

۶؎ اصحاب الاخدود (خندق والے) سے اشارہ ایک مخصوص واقعہ کی طرف ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اہل ایمان کو محض ان کے ایمان لانے کی بنا پر آگ سے بھری ہوئی خندق میں جھونک دیا گیا تھا۔ اور ظالم اس خندق کے پاس بیٹھ کر ان کے جلنے کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ یہ واقعہ کب اور کہاں پیش آیا اس کی تفصیل قرآن نے نہیں بتلائی۔ کیوں کہ سبق آموزی کے لئے اتنی بات ہی کافی ہے۔ رہا تاریخی ثبوت تو تاریخ اہل ایمان کے نذر آتش کئے جانے کے واقعات سے بھری پڑی ہے، جس کا آغاز حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آتش نمرود میں جھونک دیئے جانے سے ہوتا ہے۔ اور مظالم کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ چنانچہ محض اس بنا پر کہ فلاں گروہ کا دین اسلام ہے اس کے افراد کو نذر آتش کیا جاتا ہے، یا انہیں گھروں میں بند کر کے آگ لگا دی جاتی ہے۔ ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ اس مقصد کے لئے اب خندقیں کھودنے کی ضرورت پیش نہیں آتی اور نہ لکڑیوں کا ایندھن جمع کرنا پڑتا ہے، بلکہ پٹرول اور اس قسم کی دوسری چیزیں ہی کافی ہو جاتی ہیں۔

جہاں تک روایات کا تعلق ہے اتنی بات تو صحیح معلوم ہوتی ہے کہ یمن کے یہودی بادشاہ ذونُواس نے غالباً ۵۲۳ء میں نجران پر حملہ کر کے وہاں کے لوگوں کو، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے تھے۔ اور سچے مؤمن تھے، یہودی مذہب قبول کرنے کا حکم دیا۔ اور ان کے انکار کرنے پر انہیں خندقیں کھود کر آگ میں جھونک دیا گیا۔ (سیرت ابن ہشام ج ا ص ۳۵)

اسٹینڈرڈ جیوش انسائیکلو پیڈیا میں بھی مختصراً اس کا ذکر موجود ہے: (The Standard Jewish Encyclopedia - p. 554) نجران مکہ سے قریب ہونے کی وجہ سے یہ قصہ عربوں میں مشہور رہا ہوگا۔ اور عجب نہیں کہ قرآن نے اصحاب الاخدود کہہ کر اس واقعہ کی طرف خصوصیت سے اشارہ کیا ہو۔ لیکن روایات میں غلام اور راہب وغیرہ کا جو قصہ بیان کیا گیا ہے اس میں بڑی نکارت ہے۔ اس قصہ میں غلام کے تعلق سے ایسی عجیب وغریب باتیں بیان کی گئی ہیں جو ایک نبی کے معجزے سے بھی بڑھ کر ہیں۔ اس روایت کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف صحیح نہیں۔ چنانچہ ابن کثیر فرماتے ہیں:

قال شیخنا الحافظ ابو الحجاج المزّی فیحتمل ان یکون من کلام صهیب الرومی فانه کان عنده من اخبار النصاریٰ۔

''ہمارے شیخ حافظ ابوالحجاج مزّی فرماتے ہیں کہ اس روایت میں یہ احتمال ہے کہ یہ قصہ صہیب رومی کے کلام کا جزء ہو۔ اس لئے کہ انہیں نصاریٰ کے قصوں کا علم تھا۔'' (تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۴۹۴)

اور قفال کہتے ہیں:

''اصحابُ الاخدود کے سلسلہ میں (مفسرین نے) مختلف روایات بیان کی ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی صحیح نہیں ہے۔ بجز اس کے کہ یہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ مؤمنین کے ایک گروہ نے اپنی قوم یا کافر بادشاہ کی جو، ان پر حکمراں تھا مخالفت کی تھی۔ جس کی وجہ سے اس نے ان کو خندق میں ڈال دیا تھا۔'' (التفسیر الکبیر للرازی مطبوعہ طہران ج ۲۱ ص ۱۱۷)

افسوس کہ ایسی بے سروپا روایتیں بڑی بڑی تفسیروں میں جگہ پا گئیں۔

۷۔ یعنی ڈھٹائی اور سنگدلی کی حد ہے کہ اہل ایمان پر ایسا انسانیت سوز ظلم ڈھاتے ہوئے انہیں ذرا تامل نہیں ہوا۔ بلکہ ان کی اخلاقی حِس اتنی مُردہ ہوگئی تھی کہ وہ بڑی بے شرمی کے ساتھ ان کے جلنے کا تماشا دیکھتے رہے۔

۸۔ یعنی اہل ایمان کا اگر کوئی قصور تھا تو وہ صرف یہ ہے کہ وہ اللہ پر صحیح معنیٰ میں ایمان لائے تھے۔ گویا جو سب سے بڑی نیکی تھی، وہی ان ظالموں کی نظر میں جرم قرار پائی۔

۹۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی جو صفات بیان کی گئی ہیں، ان سے مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ وہی ہستی اس کی مستحق ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے اور اس سے تعلق استوار کیا جائے۔

۱۰۔ اس میں ظالموں کے لئے تنبیہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ سب کچھ دیکھ رہا ہے تو تمہارا ظلم تابہ کے؟ ایک دن تمہاری گرفت ہونا ہے اور تمہیں عدالتِ خداوندی کے کٹہرے میں کھڑا ہونا ہے۔

۱۱۔ یہ سخت وعید ان لوگوں کو سنائی گئی ہے، جو مؤمن مردوں اور عورتوں پر محض اس لئے ظلم ڈھائیں، تاکہ ان کو اسلام سے پھیرا جا سکے۔ جلنے کے عذاب کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا گیا ہے، کیوں کہ ان ظالموں نے مؤمنین کو آگ میں زندہ جلایا تھا۔ ایسے لوگوں کو جہنم میں دوسرے عذابوں کے ساتھ خاص طور سے سخت قسم کی آگ میں جلنے کے عذاب کا مزا بھی چکھنا پڑے گا۔

اس آیت سے ضمناً یہ بھی واضح ہوا کہ اتنے بڑے جرم کا مرتکب بھی، اگر توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لیتا ہے، تو اس کے لئے بخشش کے دروازے کھلے ہیں۔

۱۲؎ یعنی اس ظلم وستم کے باوجود لوگ اپنے ایمان میں ثابت قدم رہے۔

۱۳؎ یعنی بڑی کامیابی دنیا حاصل کرنا نہیں بلکہ جنت حاصل کرنا ہے۔

۱۴؎ یعنی ظالم اس مغالطہ میں نہ رہیں کہ وہ اللہ کی پکڑ سے بچ سکیں گے۔

۱۵؎ یعنی جزا وسزا کے لئے انسان کو دوبارہ پیدا کیا جائے گا۔ اور یہ دوبارہ پیدا کرنا اس ہستی کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں جس نے پہلی بار پیدا کیا ہے۔

وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ﴿۱۴﴾
ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ﴿۱۵﴾
فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴿۱۶﴾
هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ﴿۱۷﴾
فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ ﴿۱۸﴾
بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ ﴿۱۹﴾
وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ ﴿۲۰﴾
بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿۲۱﴾
فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿۲۲﴾

۱۴ اور وہ بخشنے والا ۱۶ے ،محبت کرنے والا ہے، ۱۷ے
۱۵ عرش کا مالک ۱۸ے ، صاحب عظمت، ۱۹ے
۱۶ اور جو چاہے کرڈالنے والا۔ ۲۰ے
۱۷ کیا تمہیں لشکروں کی خبر پہنچی ہے؟
۱۸ فرعون ۲۱ے اور ثمود ۲۲ے کے لشکروں کی؟
۱۹ لیکن یہ کافر جھٹلانے ہی میں لگے ہوئے ہیں،
۲۰ اور اللہ ان کو آگے پیچھے سے گھیرے ہوئے ہے۔ ۲۳ے
۲۱ (یہ کلام افتراء نہیں) بلکہ یہ عظیم قرآن ہے،
۲۲ جو لوح محفوظ میں (ثبت) ہے۔ ۲۴ے

۱۶؎ وہ بخشنے والا ہے۔لہٰذا اگر تم توبہ کرو اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کرلو،تو اس بات کے مستحق ہو سکتے ہو کہ بخشے جاؤ۔

۱۷؎ یعنی وہ اپنے بندوں سے نفرت نہیں، بلکہ محبت رکھتا ہے بشرطیکہ وہ اس کے وفادار بندے بن کر رہیں۔

۱۸؎ ''عرش'' کے معنی تخت کے ہیں اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا تختِ سلطنت ہے جس کی کیفیت ہمیں نہیں معلوم۔

یہاں عرش کا مالک کہہ کر یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ پوری کائنات پر اسی کا اقتدار قائم ہے اور تنہا وہی فرمانروائی کر رہا ہے۔لہٰذا اس سے سرکشی کرنے والے اور اس کے وفادار بندوں پر ظلم ڈھانے والے اس کی گرفت سے ہرگز نہیں بچ سکتے۔

۱۹؎ یعنی عظمت وجلالت (Majesty) اس کی صفت ہے۔اور اس عظمت وجلالت میں کوئی اس کا شریک نہیں۔لہٰذا بندوں کو چاہئے کہ اس کی جلالتِ شان کے تصور سے لرزاں ہوں۔

۲۰؎ یعنی دنیا کی کوئی طاقت ایسی نہیں جو اس کے کام اور منصوبہ میں مزاحم ہو سکے۔

۲۱؎ ملاحظہ ہو سورہ نازعات نوٹ ۱۳؎۔

۲۲؎ ''ثمود'' ایک قوم کا نام ہے جو ''حجر'' (مدینہ اور تبوک کے درمیان کا علاقہ) میں آباد تھی۔اس کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کا ہے۔اور اس کی طرف اللہ تعالیٰ نے حضرت صالح علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر بھیجا تھا۔مگر اس نے سرکشی کی جس کے نتیجہ میں اس پر سخت عذاب نازل ہوا۔ اس کے تباہ شدہ کھنڈرات آج بھی ''حجر'' کے علاقہ میں موجود ہیں اور صدا دے رہے ہیں کہ

ع دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

فرعون اور ثمود کو دنیوی شان وشوکت اور اقتدار حاصل تھا۔مگر وہ اقتدار کے نشہ میں سرکشی اور ظلم پر اتر آئے تھے۔لیکن جب اللہ تعالیٰ نے ان کو پکڑا تو وہ بہت بُرے انجام سے دوچار ہوئے۔ان تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن اپنے مخاطبین سے کہہ رہا ہے، کہ کیا تم بھی ان کی سی روش اختیار کر کے اسی انجام سے دوچار ہونا چاہتے ہو؟

۲۳؎ یعنی یہ جھٹلانا چاہتے ہیں تو جھٹلائیں اس سے حقیقت نہیں بدلتی۔وہ پوری طرح اللہ کی گرفت میں ہیں۔اس سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔

۲۴؎ ''لوح محفوظ'' کے معنی محفوظ تختی کے ہیں۔اور اس سے مراد ملاءِ اعلیٰ کی وہ مقدس تختی ہے، جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے کلمات لکھ دیئے ہیں۔ اُس کا لکھا بالکل اٹل ہے اور اس تک کسی جن وانس کی رسائی نہیں ہے۔قرآن کوئی خیالی اور نظریاتی چیز نہیں۔اور نہ کسی کاہن کا کلام ہے۔بلکہ اس کا منبع وہ چشمۂ صافی ہے جسے لوح محفوظ کہتے ہیں۔اس لئے اس کی ہر بات حق ہے اور پوری ہو کر رہنے والی ہے۔

سورۂ الطارق

۸۶۔ الطارق

نام آیت ۱ میں الطارق (رات میں نمودار ہونے والے ستاروں) کا ذکر ہوا ہے۔ اس مناسبت سے اس سورہ کا نام 'الطارق' رکھا گیا ہے۔

زمانۂ نزول یہ سورہ مکی ہے اور اس وقت کی نازل شدہ ہے جب اہل مکہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پہنچ چکی تھی۔ مگر وہ اس کو مذاق قرار دے کر اس کے خلاف چالیں چلنے لگے تھے۔

مرکزی مضمون محاسبہ کے لئے انسان کا دوبارہ پیدا کیا جانا ہے۔

نظمِ کلام آیت ۱ تا ۴ میں آسمان اور ستاروں کی شہادت، اس بات پر کہ ہر شخص کی نگرانی ہو رہی ہے۔ اور ایک روز آنا ہے جب کہ اسے حساب کے لئے طلب کیا جائے گا۔

آیت ۵ تا ۸ میں انسان کی خلقت سے اس کے دوبارہ پیدا کئے جانے پر استدلال ہے۔

آیت ۹ اور ۱۰ میں اس حقیقت کا اظہار کہ اس دن سارے راز، پرکھے جائیں گے اور انسان بالکل بے بس ہوگا۔ اسے کہیں سے کوئی مدد مل نہ سکے گی۔

آیت ۱۱ تا ۱۴ میں آسمان و زمین کی شہادت اس بات پر پیش کی گئی ہے کہ قرآن یوم جزا کی جو خبر دے رہا ہے، وہ ایک فیصل شدہ اور قطعی بات ہے۔

آیت ۱۵ تا ۱۷ خاتمۂ کلام ہے، جس میں کفار کو متنبہ کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ ان کی چالیں الٹی پڑیں گی۔ البتہ انہیں تھوڑی مہلت دے دو، ان کا انجام بس سامنے آنے ہی کو ہے۔

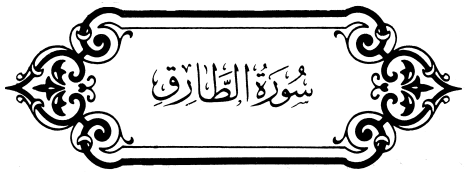

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ۙ﴿۱﴾

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ۙ﴿۲﴾

النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۙ﴿۳﴾

اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ؕ﴿۴﴾

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ؕ﴿۵﴾

خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۙ﴿۶﴾

يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ؕ﴿۷﴾

اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ؕ﴿۸﴾

يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ۙ﴿۹﴾

فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ؕ﴿۱۰﴾

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۙ﴿۱۱﴾

وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ۙ﴿۱۲﴾

اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۙ﴿۱۳﴾

وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ؕ﴿۱۴﴾

اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ۙ﴿۱۵﴾

وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ۚ﴿۱۶﴾

فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۧ﴿۱۷﴾

۸۶۔ سُوْرَةُ الطَّارِقِ

آیات: ۱۷

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ قسم ہے اے آسمان کی ۲، اور رات میں نمودار ہونے والے کی،

۲ اور تمہیں کیا معلوم کہ رات میں نمودار ہونے والا کیا ہے؟ ۳

۳ دمکتا ستارہ، ۴

۴ کوئی شخص ایسا نہیں جس پر ایک نگہبان نہ ہو۔ ۵

۵ انسان ذرا غور کرے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ ۶

۶ اُچھلتے پانی سے، ۷

۷ جو ریڑھ اور پسلیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔ ۸

۸ یقیناً وہ (اللہ) اس کے لوٹانے پر قادر ہے۔ ۹

۹ جس دن چھپی باتیں پرکھی جائیں گی، ۱۰

۱۰ اس وقت اس کے پاس نہ کوئی قوت ہوگی، اور نہ کوئی اس کا مددگار ہوگا۔ ۱۱

۱۱ قسم ہے آسمان کی جو بارش برساتا ہے، ۱۲

۱۲ اور زمین کی جو پھٹ جاتی ہے، ۱۳

۱۳ کہ یہ ایک طے شدہ بات ہے، ۱۴

۱۴ ہنسی مذاق نہیں۔ ۱۵

۱۵ یہ لوگ ایک تدبیر کر رہے ہیں، ۱۶

۱۶ اور میں بھی ایک تدبیر کر رہا ہوں۔ ۱۷

۱۷ تو ان کافروں کو مہلت دو۔ بس تھوڑی مہلت۔ ۱۸

۱؎ قسم کی تشریح کے لئے ملاحظہ ہو سورہ تکویر نوٹ ۱۴؎۔

۲؎ آسمان کی تشریح کے لئے ملاحظہ ہو سورہ انشقاق نوٹ ۱؎۔

۳؎ یہ سوال ''رات میں نمودار ہونے والے'' کی اہمیت کو واضح کرنے کیلئے ہے۔یعنی رات میں نمودار ہونے والی چیز ایسی نہیں ہے کہ اس پر سے یونہی گذر جاؤ۔ بلکہ وہ تمہیں دعوت فکر دیتی ہے۔لہٰذا اس پر سنجیدگی سے غور کرو اور اس غور وفکر کا مقصد خالقِ کائنات کی معرفت حاصل کرنا ہو، نہ کہ محض ''معلومات'' میں اضافہ کرنا۔

۴؎ النجم الثاقب (دمکتا ستارہ) سے مراد کوئی خاص ستارہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ ستاروں کی جنس کے مفہوم میں ہے۔یعنی وہ تمام ستارے جو خوب روشن اور درخشاں نظر آتے ہیں، جن کو ہر شخص کھلی آنکھ سے دیکھ لیتا ہے۔

آسمان میں بکھرے ہوئے تارے اس کثرت سے ہیں کہ ان کی صحیح تعداد معلوم کرنے سے، موجودہ علم فلکیات (Astronomy) بھی باوجود اپنی تمام تر سائنسی ترقیوں کے قاصر ہے۔ جدید ماہرین فلکیات کے اندازہ کے مطابق، جس کہکشاں میں ہماری زمین واقع ہے اس میں کوئی ایک بلین (One Bilion) ستارے ہوں گے۔

(The Cambridge Encyclopedia of Astronomy p. 313) اس سے آسمان کی وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، جس کو اس سورہ میں دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

ان گنت ستاروں میں سے دمکتے ستاروں کو یہاں شہادت کے طور پر، اس لئے پیش کیا گیا ہے کہ یہ اپنی چمک دمک کی وجہ سے، ہر دیکھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ''منزل'' کا پتہ بتا دیتے ہیں۔

۵؎ یہ وہ بات ہے جس پر آسمان اور دمکتے ستاروں کی شہادت پیش کی گئی ہے۔ یہ شہادت اس مفہوم میں ہے کہ آسمان پر ستاروں کی جگمگاہٹ، انسان کو دعوتِ نظارہ ہی نہیں دعوتِ فکر بھی دیتی ہے۔رات کے آتے ہی آسمان کو قمقموں سے سجایا جاتا ہے۔اور قمقمے بھی ایسے روشن کہ ان کی تابناکی عقل کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔اور موجودہ فلکیاتی اکتشافات نے، جس کی رُو سے بعض ستارے تو اتنی دوری پر واقع ہیں کہ ان کی روشنی زمین تک پہنچنے کیلئے کئی نوری سال لگ جاتے ہیں، انسان کو اور زیادہ حیرت میں ڈال دیا ہے۔کیا یہ مشاہدہ اپنے خالق کے کمالِ قدرت کا اور کائنات کی عظیم سلطنت کے فرمانروا ہونے کا پتہ نہیں دیتا؟ اور انسان میں یہ احساس پیدا نہیں کرتا کہ اس فرمانروائے عظیم کی سلطنت میں، انسان کی یہ حیثیت ہو ہی نہیں سکتی کہ وہ اپنی من مانی کرنے کے لئے آزاد ہو، اور فرمانروائے کائنات کے حضور جوابدہ نہ قرار پائے؟ یہ مشاہدہ بشرطیکہ وہ غیر متعصّبانہ اور معروضی نوعیت کا ہو، انسان کے اندر ذمہ داری کا احساس لازماً پیدا کرتا ہے۔اور یہیں سے خدا کے حضور جوابدہی اور جزا وسزا کا تصور اُبھرتا ہے۔اور یہی وہ حقیقت ہے جس سے پیغمبر، انسان کو خبردار کرنا چاہتا ہے۔اور یہی وہ دعوت ہے جس کو قرآن دنیائے انسانیت کے سامنے پیش کر رہا ہے۔

اور جب اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انسان ایک ذمہ دار مخلوق ہے، تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس کی عملی زندگی کا ریکارڈ تیار کیا جائے، تاکہ خدا کے حضور پیشی کے دن اس کی بنیاد پر جزا یا سزا کا فیصلہ ہو۔قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا پورا پورا انتظام کیا ہے۔ چنانچہ ہر شخص کے ساتھ نگراں فرشتے لگا دئے گئے ہیں، جو اس کے ہر قول وفعل کو ضبطِ تحریر میں لاتے اور اس کی عملی زندگی کا پورا ریکارڈ تیار کرتے رہتے ہیں۔

۶؎ منکرین آخرت کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ انسان کو دوبارہ پیدا کرنا ممکن نہیں۔ان کے اس اعتراض کا جواب قرآن نے یہ دیا کہ منکرین، خدا کو قادرِ مطلق نہیں سمجھتے۔اسی لئے ان کے نزدیک انسان کو اس کے مرنے کے بعد اٹھا کھڑا کرنا ممکن نہیں۔

لیکن خدا کی قدرت کا یہ تصور سراسر باطل ہے کیوں کہ یہ کسی بھی دلیل پر مبنی نہیں ہے۔اور اس کی تردید کائنات کی ہر چیز کرتی ہے۔اسی سلسلہ میں انسان کو متوجہ کیا گیا ہے کہ ذرا وہ اپنی خلقت ہی پر غور کرے،تو اس کی سمجھ میں یہ بات آسانی سے آئے گی کہ،جس ہستی نے انسان کو پہلی بار پیدا کیا وہ اسے دوسری بار بھی پیدا کرسکتا ہے۔

۷۔ مراد مادۂ تولید ہے۔

۸۔ ریڑھ اور پسلیوں کے درمیان سے نکلنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ریڑھ اور پسلیوں کے اندر سے مادۂ تولید خارج ہوتا ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ انسانی جسم کے اس جوف میں،جس کے ایک طرف ریڑھ کی ہڈی اور دوسری طرف پسلیاں ہیں ایک رقیق مادہ تیار ہوتا ہے اور وہاں سے اس طرح خارج ہوتا ہے جیسے پچکاری کا عمل۔

مِنۡ بَیۡنِ (درمیان سے) کے الفاظ اس مفہوم میں قرآن میں دوسری جگہ بھی استعمال ہوئے ہیں۔سورہ نحل آیت ۶۶ میں ہے:

نُسۡقِیۡکُمۡ مِمَّا فِیۡ بُطُوۡنِہٖ مِنۡۢ بَیۡنِ فَرۡثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیۡنَ۔

''ہم ان کے پیٹ سے گوبر اور خون کے درمیان سے تمہیں خالص دودھ پلاتے ہیں،جو پینے والوں کے لئے نہایت خوشگوار چیز ہے۔''

ظاہر ہے اس آیت میں بھی مِنۡ بَیۡنِ فَرۡثٍ وَّ دَمٍ (گوبر اور خون کے درمیان سے) کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خالص دودھ گوبر اور خون کے اندر سے نکلتا ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس جسم کے اندر گوبر اور خون جیسی کثافتیں پیدا ہوتی ہیں،اسی جسم میں خالص دودھ،جیسی لطیف چیز بھی تیار ہوتی ہے،جو اللہ تعالیٰ کے کمالِ قدرت اور اس کی عظیم حکمت پر دلالت کرتی ہے۔اسی طرح آیت زیر بحث میں بھی کہنے کا منشاء یہ ہے کہ انسانی ڈھانچہ کے اندر سے بڑے عجیب طریقہ سے وہ مادہ خارج ہوتا ہے،جو ہوتا تو ہے بے وقعت،لیکن اس سے انسان جیسی عظیم مخلوق پیدا ہوتی ہے۔کیا یہ اللہ تعالیٰ کے کمالِ قدرت اور اس کی عظیم صناعی کی دلیل نہیں؟ پھر اس کے بارے میں یہ گمان کرنے کے لئے کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ انسان کو دوبارہ پیدا کرنا ممکن نہیں؟

واضح رہے کہ ریڑھ اور پسلیوں کے درمیان سے مادۂ منویہ کے خارج ہونے کا جو ذکر کیا گیا ہے،اس سے اس بات کی نفی نہیں ہوتی کہ مادۂ منویہ کیسۂ منویہ (Seminal Vesicles) سے خارج ہوتا ہے۔کیوں کہ کیسۂ منویہ جوفِ شکم (Abdominal) میں ہوتا ہے جو آخری پسلی کا زیریں حصہ ہے۔اور جس کی دوسری طرف پشت یعنی ریڑھ کی ہڈیاں ہیں۔اس لئے وسیع تر مفہوم میں یہ اس ڈھانچہ کے درمیان ہی سے خارج ہوتا ہے،جس کا اگلا حصہ پسلیاں ہیں تو پچھلا حصہ ریڑھ۔اور قرآن جب تذکیر کے لئے کوئی بات کہتا ہے،تو وہ عام اور وسیع تر مفہوم میں ہوتی ہے نہ کہ فنی زبان میں۔ اس لئے قرآن نے مادۂ تولید کے اخراج کے سلسلہ میں یہاں جو کچھ بیان کیا ہے،اسے علمِ تشریح الاعضاء (Anatomy) کی اصطلاحات میں سوچنا صحیح نہ ہوگا۔

انسان کی تخلیق جس مادۂ منویہ سے ہوتی ہے،قرآن نے اس پر غور کرنے کی دعوت دی ہے۔اور جب ہم جدید تحقیقات کا مطالعہ کرتے ہیں تو اپنے خالق کے کرشمۂ قدرت کو دیکھ کر ششدر رہ جاتے ہیں۔جدید تحقیقات کے رُو سے ایک وقت میں جو مادۂ منویہ (Semen) خارج ہوتا ہے،اس کی مقدار ۲ تا ۵ ملی لیٹر (I 2 to 5 m) ہوتی ہے۔اور ہر ملی لیٹر (ml) میں تولید کے جراثیم (Spermetozoa) ۴۰ تا ۱۰۰ ملین (40-100 millions) ہوتے ہیں۔ (Text Book of Physiology by George Bell- Edinburgh p643) گویا مرد کے ایک وقت کے خارج شدہ مادۂ منویہ میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ وہ پچاس کروڑ انسان پیدا کرسکتا ہے۔یہ اور بات ہے کہ اس کے خالق نے اُن

جراثیم کے بارآور (Fertilize) ہونے کا ایسا نظام بنایا ہے کہ بیک وقت ایک یا دو سے زیادہ جرثومے بارآور ہونہیں سکتے۔اس طرح سے انسانی پیدائش کی شرح حد سے تجاوز نہیں کر پاتی۔خدا کے کرشمۂ قدرت کا یہ مشاہدہ کیا انسان کے اندر اس کی بے پناہ قدرت کا یقین پیدا نہیں کرتا؟ اور کیا اسے اس بات کا قائل نہیں کرتا کہ اس کے لئے مرے ہوئے انسان کو دوبارہ اٹھانا کچھ بھی مشکل نہیں؟

۹؎ لوٹانے سے مراد انسان کو جسم سمیت دوسری مرتبہ پیدا کرنا ہے اور یہ قیامت کے دن ہوگا۔

۱۰؎ یعنی اس روز کوئی راز، راز نہیں رہے گا۔انسان کی باطنی کیفیت کا حال کھل کر سامنے آجائے گا۔اس کی نیت، اسکے ارادے، اس کے عمل کے محرکات اور وہ اغراض و مقاصد، جو اس کے اعمال کی پشت پر رہے ہیں، سب بے نقاب ہو کر سامنے آجائیں گے۔گویا اس کے باطن کی پوری طرح اسکریننگ (Screening) کی جائے گی اور نیت کا جہاں کہیں کھوٹ ہوگا بالکل نمایاں ہو کر سامنے آجائے گا۔اس روز انسان کو اندازہ ہو جائے گا کہ وہ حق کو باطل قرار دینے کے لئے ایڑی چوٹی کا جو زور لگاتا رہا، اس کے پیچھے اس کی کیا اغراض تھیں، جن کو اس نے اپنے دل میں چھپائے رکھا تھا۔

۱۱؎ مطلب یہ ہے کہ نہ وہ خود اپنی مدافعت کر سکے گا اور نہ دوسرا کوئی اس کا حمایتی بن کر کھڑا ہوگا کہ اس کی مدد کر سکے۔

۱۲؎ ''آسمان سے بارش کا برسنا'' اوپر سے بارش برسنے کے معنیٰ میں ایک عام محاورہ ہے۔

۱۳؎ یعنی بارش کے برستے ہی زمین کے مسامات کھل جاتے ہیں اور وہ شق ہو کر نباتات اگاتی ہے۔گویا جو زمین مُردہ پڑی تھی، بارش کے ہوتے ہی زندہ ہو کر لہلہانے لگی۔یہ مشاہدہ جو انسان رات دن کرتا ہے، اسی کو یہاں زندگی بعد موت کی تائید میں پیش کیا جا رہا ہے۔یعنی جو خدا مُردہ زمین کو زندہ کر سکتا ہے وہ مُردوں کو کیوں نہیں جلا اٹھا سکتا؟ کیا اس مشاہدہ سے یہ یقین پیدا نہیں ہوتا کہ جو زمین بارش کی صورت میں خدا کے حکم سے نباتات کو اگل دیتی ہے، وہ اس کے حکم سے مُردوں کو کیوں نہیں اگل سکتی؟

ضمناً یہاں توحید کا پہلو بھی ابھر کر سامنے آگیا ہے۔کیوں کہ آسمان کا بارش برسانا اور زمین کا پانی اپنے اندر جذب کر کے نباتات اُگانا، اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ دونوں کا نظم ایک خدا کے ہاتھ میں ہو۔اس سے ثابت ہوا کہ جو خدا زمین کا ہے وہی آسمان کا بھی ہے۔ورنہ آسمان و زمین میں اس درجہ توافق اور سازگاری نہیں ہو سکتی تھی۔اس سے اس مشرکانہ تصور کی جڑ کٹ جاتی ہے کہ آسمان کا دیوتا الگ اور زمین کا دیوتا الگ۔

۱۴؎ یعنی قرآن جس آنے والے دن کی خبر دے رہا ہے وہ ایک فیصل شدہ قطعی اور اٹل بات ہے۔

۱۵؎ یعنی اتنی اہم خبر اور اتنی سنجیدہ بات کو ہنسی مذاق قرار دینا ان ہی لوگوں کا کام ہو سکتا ہے، جو حقیقت پسند بننا نہیں چاہتے۔

۱۶؎ یعنی یہ منکرین، پیغمبر کی آواز کو دبانے اور حق کو شکست دینے کے لئے ایک نہ ایک چال چل رہے ہیں۔

۱۷؎ یعنی منکرین کی چال کا توڑ میں بھی کر رہا ہوں۔مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ منکرین کی چالوں کو ناکام بنانے اور ان کو ان کے دام میں پھنسانے کی تدبیر ایسے طریقہ سے کر رہا ہے کہ انہیں اس کا کوئی اندازہ نہیں۔

اور واقعہ یہ ہے کہ جن کافروں نے قرآن اور پیغمبر کے خلاف چالیں چلی تھیں وہ سب انہیں کے خلاف پڑیں۔اور وہ بری طرح ناکامی اور ذلت سے دوچار ہوئے۔یہ تو ہوا دنیا میں حق کے خلاف چال چلنے کا انجام! اور آخرت میں تو وہ عیاناً دیکھ لیں گے کہ انہوں نے جو کلہاڑی چلائی تھی، وہ اپنے ہی پاؤں پر چلائی تھی۔اور جو قبر کھودی تھی اس میں ان ہی کو دفن ہونا ہے، اور دفن بھی آگ کے کفن کے ساتھ ہونا ہے۔

۱۸؎ یعنی ان کو اپنا پیمانہ بھر لینے دو۔ان کے انجام کے سلسلہ میں جلدی نہ کرو بلکہ صبر کے ساتھ اپنا فرض انجام دیئے چلے جاؤ۔جو مہلت ان کافروں کو دی جا رہی ہے وہ جلد ہی ختم ہو جائے گی اور عنقریب ان کی گرفت ہوگی۔

سورۂ الاعلیٰ

۸۷۔ الاعلیٰ

نام پہلی آیت میں خدا کی صفت الاعلیٰ بیان ہوئی ہے۔اسی مناسبت سے اس سورہ کا نام ''الاعلیٰ'' رکھا گیا ہے۔

زمانۂ نزول یہ سورہ مکی ہے اور مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اس وقت کی نازل شدہ ہے، جب کہ نزول وحی کا آغاز ہوئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔اور آپ ﷺ قرآن کو اخذ کرنے میں یہ اندیشہ محسوس کر رہے تھے کہ کہیں کوئی آیت بھول نہ جائیں۔اسی طرح دعوت و تذکیر کا کام بھی بالکل ابتدائی مرحلہ میں تھا۔

مرکزی مضمون فلاحِ آخرت ہے۔ اور اس کا دارومدار ہدایتِ خداوندی کو قبول کرنے پر ہے، جو قرآن کی شکل میں پیغمبر پر نازل ہو رہی ہے۔

اس سورہ میں خطاب براہ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔اور بالواسطہ قرآن کے ہر پڑھنے والے سے۔البتہ آگے چل کر خطاب کا رخ دنیا پرستوں کی طرف ہو گیا ہے۔

نظمِ کلام آیت ۱ تا ۵ میں خدا کی پاکیزگی بیان کرنے کا حکم دیتے ہوئے اس کی صفات بیان کی گئی ہیں، تاکہ انسان صحیح معنیٰ میں خدا شناس بن جائے۔

آیت ۶ تا ۸ میں وحی الٰہی کو پیغمبر کے حافظہ میں محفوظ کئے جانے کا یقین دلایا گیا ہے، جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تسلی اور ہر طالبِ حق کے لئے اطمینان کا سامان ہے۔

آیت ۹ تا ۱۵ میں تذکیر کی ہدایت کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ اس سے، کس قسم کے لوگ فائدہ اٹھائیں گے اور کس قسم کے لوگ دور رہیں گے۔اور پھر ان میں سے ہر ایک کے رویہ کا نتیجہ آخرت میں کیا نکلے گا؟

آیت ۱۶ تا ۱۹ خاتمۂ کلام ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو ترجیح دینا وہ بنیادی غلطی ہے، جس کی بنا پر انسان وحی کی رہنمائی سے محروم رہتا ہے۔اور برے انجام سے دوچار ہوتا ہے۔قرآن ہی میں نہیں اگلے صحیفوں میں بھی یہی بات بتلائی گئی تھی۔

فضیلت یہ سورہ مختصر ہونے کے باوجود توحید، رسالت اور آخرت تینوں مضامین پر مشتمل ہے۔اور تذکیر کا پہلو بھی مؤثر انداز میں آ گیا ہے۔ اس لئے جمعہ اور عیدین کی نمازوں میں قرأت کے لئے زیادہ موزوں قرار پائی ہے۔چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدین اور جمعہ میں سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی اور ھَلْ اَتَاکَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَۃِ (یعنی سورہ اعلیٰ اور سورہ غاشیہ) پڑھا کرتے تھے۔

(مسلم کتابُ الجمعہ)

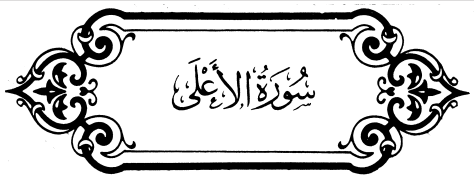

سُوْرَةُ الْأَعْلٰى

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ﴿١﴾
الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ﴿٢﴾
وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ﴿٣﴾
وَالَّذِيْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ﴿٤﴾
فَجَعَلَهٗ غُثَاۗءً اَحْوٰى ﴿٥﴾
سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ﴿٦﴾
اِلَّا مَا شَاۗءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ﴿٧﴾
وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ﴿٨﴾
فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ﴿٩﴾
سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ﴿١٠﴾
وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ﴿١١﴾
الَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ﴿١٢﴾
ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ﴿١٣﴾
قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴿١٤﴾
وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴿١٥﴾
بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿١٦﴾
وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿١٧﴾
اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿١٨﴾
صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ﴿١٩﴾

۸۷۔ سورۃ الاعلیٰ

آیات:۱۹

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ اپنے رب اعلیٰ [۱] کے نام کی تسبیح کرو، [۲]
۲ جس نے پیدا کیا اور متناسب بنایا، [۳]
۳ جس نے منصوبہ بنایا [۴]، اور رہنمائی کی، [۵]
۴ جس نے چارہ اُگایا،
۵ پھر اس کو سیاہ کوڑا کرکٹ بنایا۔ [۶]
۶ (اے نبی!) ہم تمہیں پڑھائیں گے پھر تم نہیں بھولو گے، [۷]
۷ مگر جو اللہ چاہے [۸]۔ وہ کھلی بات کو بھی جانتا ہے اور چھپی بات کو بھی۔ [۹]
۸ اور ہم تمہارے لئے آسانی کی راہ ہموار کردیں گے۔ [۱۰]
۹ لہٰذا تم نصیحت کرو، اگر نصیحت کرنا مفید ہو۔ [۱۱]
۱۰ نصیحت قبول کرے گا وہ، جو ڈرتا ہوگا، [۱۲]
۱۱ اور اس سے گریز کرے گا وہ، جو بڑا بدبخت ہوگا۔
۱۲ وہ بڑی آگ میں داخل ہوگا،
۱۳ پھر نہ اس میں مرے گا اور نہ جئے گا۔ [۱۳]
۱۴ کامیاب ہوا وہ، جس نے پاکیزگی اختیار کی، [۱۴]
۱۵ اور اپنے رب کا نام لیا [۱۵]۔ اور نماز پڑھی، [۱۶]
۱۶ مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔ [۱۷]
۱۷ حالانکہ آخرت بدرجہا بہتر اور پائدار ہے۔ [۱۸]
۱۸ یہ (تعلیم) اگلے صحیفوں میں بھی دی گئی تھی،
۱۹ ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں (بھی)۔ [۱۹]

۱؎ رب کی تشریح سورہ فاتحہ نوٹ ۴؎ میں گذر چکی۔

یہاں رب کی صفتِ اعلیٰ بیان ہوئی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خدا جو تمام انسانوں اور ساری مخلوقات کا پروردگار اور مالک و آقا ہے، ایک برتر اور بالاتر ہستی ہے۔ اس کی شان اور اس کا رتبہ بہت بلند ہے۔ انسان فطرۃً اس کو جانتا ہے اور عقل اس کو پہچانتی ہے۔ یہاں یہ بات بھی سمجھ لینا چاہئے کہ اس بلند و بالا ہستی کی کُنہ معلوم کرنے اور اس کو اپنی عقل کی گرفت میں لینے کی کوشش بالکل بے سود ہے۔

؎ جو سمجھ میں آ گیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا عقل سے جو گھر گیا لا انتہا کیونکر ہوا

جو لوگ اس کی معرفت حاصل کرنے کی بجائے، اس کی اصل حقیقت معلوم کرنے کے پیچھے پڑ گئے، وہ فلسفیانہ باتوں میں الجھ کر بالکل بھٹک گئے۔ مثال کے طور پر جنہوں نے اسے ''آتما'' قرار دیا وہ ساری موجودات میں اس کے حلول کے قائل ہو گئے۔

The sage sees all beings in the Atman and the Atman in all beings.

(The Essence of Principal Upnishads. p. 5)

خدا کا یہ نہایت گھٹیا تصور ہے جو شرک کی بنیاد ہے۔ قرآن اس بنیاد ہی کو ڈھا دیتا ہے۔ اور خدا کی ذات کے بارے میں قیاس آرائیاں کرنے اور فلسفیانہ بحثیں کھڑی کرنے سے یکسر روکتا ہے۔ وہ اس کی ایسی معرفت عطا کرتا ہے، جو عقل کو جلا بخشنے والی، قلب کو مطمئن کرنے والی اور انسان کو صحیح معنیٰ میں خدا شناس بنانے والی ہے۔ یہ معرفت خدا کی صفات پر غور کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے قرآن خدا کی صفات کا تفصیل سے اور بہ کثرت ذکر کرتا ہے۔

رب کے اعلیٰ ہونے کی صفت اس مشرکانہ تصور کو باطل قرار دیتی ہے کہ خداؤں میں کوئی چھوٹا ہے تو کوئی بڑا۔ اور کوئی دیو ہے تو کوئی مہادیو۔ ساتھ ہی وہ اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ خدا صرف ایک ہے۔ اور وہی اعلیٰ و برتر ہے۔ اس کے سوا کوئی خدا ہے ہی نہیں۔ پھر کسی کے برتر ہونے کا کیا سوال؟ اور سرے سے کوئی دیو ہے ہی نہیں پھر کسی کے مہادیو ہونے کا کیا مطلب؟

۲؎ اس حکم میں تین اہم ہدایتیں مضمر ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کو ان ناموں سے یاد کیا جائے، جو اپنے معنیٰ و مفہوم کے لحاظ سے پاک اور اس کی شان اور اس کے رتبہ کے لحاظ سے بالکل موزوں اور مناسب ہوں۔ ضروری نہیں کہ وہ عربی زبان ہی کے الفاظ ہوں، بلکہ وہ کسی بھی زبان کے الفاظ ہو سکتے ہیں بشرطیکہ اس میں شرک کا تصور مضمر نہ ہو۔ نیز نقص یا بے ادبی کا بھی کوئی پہلو نکلتا نہ ہو۔ اسی بنا پر ہم اردو میں اللہ کو ''خدا'' اور ''پروردگار'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مرہٹی زبان پر مشرکانہ مذہب کا کافی اثر ہے۔ اس لئے اس زبان میں اللہ کے لئے کوئی نام تجویز کرتے ہوئے بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر، رام، ایک مذہبی شخصیت کا نام ہے جن کو وشنو کا اوتار سمجھا جاتا ہے۔

ملاحظہ ہو:۔ (Moles Worth,s Marathi English Dictionary p. 693)

اس لئے اس لفظ کو رحیم کے ہم معنیٰ سمجھ کر اللہ کے لئے ہرگز استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح شیو مشرکانہ مذہب میں تین خداؤں (تری مورتی) میں سے ایک خدا کا نام ہے۔ ساتھ ہی اس کے معنیٰ مرد کے عضو مخصوص کے بھی ہیں ملاحظہ ہو:۔

(Students Sanskrit English Dictionary by Apte p. 556)

شیولنگ کی پوجا بھی کی جاتی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مشرکوں نے اپنے خداؤں کا نام رکھنے میں کس ذہنیت کا ثبوت دیا ہے؟ (**نعوذ باللہ من ذٰلک**)۔ دوسری ہدایت یہ ہے کہ اس کی پاکیزگی بیان کرو۔ یعنی اس کو ہر قسم کے نقص، عیب اور شرک سے منزہ قرار دو۔ اور تیسری ہدایت یہ

ہے کہ اس کی تنزیہ کے تصور کے ساتھ اسی کا نام جپتے رہو کہ اسی کا نام جپنے کے لائق ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی آیت کی بنا پر سجدہ میں سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی (پاک ہے میرا رب اعلیٰ) پڑھنے کا حکم دیا تھا۔ (ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ) گویا سجدہ کی یہ تسبیح اس حکم کی تعمیل میں ہے جو اس آیت میں دیا گیا ہے۔

۳؎ اگر انسان اتفاقی حادثہ کے طور پر وجود میں آ گیا ہوتا، تو اس کے اندر تناسب، موزونیت اور حسن و جمال نہیں پیدا ہو سکتا تھا۔ یہ صریح نشانی ہے اس بات کی کہ اُسے خدائے برتر نے پیدا کیا ہے۔

۴؎ یعنی انسان کی پیدائش بغیر کسی منصوبہ کے نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ اس کے خالق نے اس کا ایک منصوبہ بنایا ہے، جس کے مطابق اسے دنیا میں ایک مقررہ مدت تک کام کرنا ہے۔ یہ منصوبہ مختصراً یہ ہے کہ دنیا کی یہ زندگی آزمائشی ہوگی اور ہر شخص کو آزمائش کے جن مراحل سے گذرنا ہوگا اور اس کو جو قوتیں اور صلاحیتیں عطا کی جائیں گی، اور جو وسائل اور مواقع فراہم کر دیئے جائیں گے، وہ سب ایک طے شدہ فیصلہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اسی کا نام قرآن کی اصطلاح میں ''تقدیر'' ہے۔ یعنی خدا کا پیشگی تیار کردہ منصوبہ۔

۵؎ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے اس منصوبہ سے انسان کو بے خبر نہیں رکھا ہے۔ بلکہ اجمالاً اس کا شعور اس کی فطرت ہی میں رکھ دیا ہے، جس کی بناء پر اس کا ضمیر اسے برائی پر ٹوکتا ہے اور اچھائی پر مطمئن ہوتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کا اچھا انجام دیکھنا چاہتا ہے۔ اور نہیں چاہتا کہ بُرا انجام اس کے سامنے آئے۔ اس لحاظ سے دیکھئے تو انسان فطرۃً اپنے کو امتحان گاہ ہی میں محسوس کرتا ہے۔ اس احساس کو جو چیز تازہ کرتی ہے اور خدائی منصوبہ سے اُسے اچھی طرح باخبر کرتی ہے وہ وحیِ الٰہی ہے، جس کا ذکر آگے کی آیات میں آ رہا ہے۔ گویا انسان کے خالق نے اس کے لئے خفی اور جلی دونوں طرح کی رہنمائی کا سامان کر دیا ہے۔ اگر فطرت کی آواز ہدایت خفی ہے تو وحیِ الٰہی ہدایتِ جلی۔ اس کے بعد انسان اپنے کئے کا آپ ذمہ دار ہے اور اس کے لئے یہ کہنے کا موقع نہیں کہ میرے رب نے میری ہدایت و رہنمائی کا سامان نہیں کیا۔

۶؎ یعنی جب چارہ اگتا ہے تو سرسبز ہوتا ہے۔ لیکن ایک وقت آتا ہے کہ سیاہ کوڑا کرکٹ بن کے رہ جاتا ہے۔ یہ ایک مثال ہے خدا کے منصوبہ کی، جو اس دنیا میں کارفرما ہے اور اس سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ پوری دنیا کے لئے بھی خدا کا ایک منصوبہ ہے۔ اور وہ منصوبہ یہ ہے کہ اس پر خزاں کو لازماً آنا ہے تاکہ اس کے بعد آخرت کا ظہور ہو۔ لہٰذا انسان اس دنیا کو سرسبز دیکھ کر اس خام خیالی میں مبتلا نہ رہے کہ یہ ہمیشہ پُر بہار رہے گی اور اس پر کبھی خزاں آنے والی نہیں۔

۷؎ اس آیت میں خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ اور فرمایا یہ جا رہا ہے کہ قرآن کی شکل میں جو وحی ہم نازل کر رہے ہیں، اس کو آپ کے ذہن میں محفوظ کر دینے کی ذمہ داری ہم نے لی ہے۔ لہٰذا اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ اس کا کوئی حصہ تم بھول جاؤ۔ واضح رہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شروع شروع میں اس اندیشہ سے کہ کہیں کوئی آیت یا لفظ بھول نہ جائیں، جب قرآن کا کوئی حصہ نازل ہوتا تو اس کو اخذ کرنے میں جلدی فرماتے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ قرآن اور پیغمبر کی صداقت کی دلیل ہے۔ کیوں کہ پورا قرآن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح یاد ہو گیا کہ آپ اس کا ایک لفظ بھی نہیں بھولے۔ اور آپ نے پوری صحت کے ساتھ مکمل قرآن کو امت کی طرف منتقل کیا۔ اور آج ہمارے سامنے اس کے لاکھوں اور کروڑوں نسخے اپنی اصل شکل میں اس طرح موجود ہیں کہ قیامت تک کیلئے اس کے محفوظ ہونے کا سامان ہو گیا ہے۔ گویا قرآن ایک مستقل اور دائمی معجزہ ہے، جس کا مشاہدہ ہر دور کے لوگ کر سکتے ہیں۔

۸؎ یعنی اگر اللہ ہی بھلانا چاہے تو اور بات ہے۔

۹۔ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اے نبی، قرآن کو یاد رکھنے کے سلسلہ میں جو اندیشہ تم اپنے دل میں محسوس کرتے ہو، اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہے اور تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ قرآن کا سبق تمہیں وہ ہستی دے رہی ہے جس کا علم تمام باتوں کو محیط ہے۔ اور اس نے اسے تمہارے حافظہ میں ٹھیک ٹھیک محفوظ کر دینے کا فیصلہ فرمایا ہے۔

۱۰۔ اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مزید اطمینان کا سامان کیا گیا ہے کہ قرآن کا جوں کا توں لوگوں تک پہنچانا، گو دشوار ترین کام ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ ان تمام دشواریوں کے درمیان سے تمہارے لئے آسان راہ نکالے گا۔

قرآن کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔ نبی ﷺ اگرچہ اُمّی تھے، لیکن نہ صرف پورے قرآن کو حفظ کرنا آپ کیلئے آسان ہو گیا، بلکہ اس کے ساتھ اس کو لوگوں تک پہنچانا، اس کا درس دینا، اس کے ذریعہ تذکیر کرنا، اس کی تشریح و توضیح کرنا، اس کے غامض نکات اور اس کی پُرحکمت باتوں کو بیان کرنا، اس سے استنباط کرنا اور اس کے احکام کو نافذ کرنا بھی آسان ہو گیا۔ اور آپ کو اللہ تعالیٰ نے تھوڑے ہی عرصہ میں ایسے ساتھی عطاء فرمائے، جو قرآن کی کتابت کا کام بحسن خوبی انجام دیتے، تاکہ آنے والی نسلوں کیلئے قرآن کی حفاظت کا سامان ہو۔ اسی طرح آپ ﷺ کو کتنے ہی ایسے ساتھی مل گئے جنہوں نے قرآن کو اپنے سینوں میں محفوظ کر لیا۔ یہ حفاظ اور قُرّاء کہلائے اور انہوں نے قرآن کو پھیلانے میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔

۱۱۔ یعنی دعوت و تبلیغ اور تذکیر و نصیحت کا کام، نہ لٹھ چلانے کا کام ہے اور نہ اندھے کے ریوڑی بانٹنے جیسا کام، بلکہ یہ ایک حکیمانہ کام ہے۔ جس کے لئے موقع و محل کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ بے موقع وعظ کہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اور نہ اندھوں اور بہروں کو نصیحت کرنے کا کچھ فائدہ ہے۔ اس لئے جہاں داعی یہ محسوس کرے کہ لوگ نصیحت کے سننے کے موڈ میں نہیں ہیں، وہاں زبردستی انہیں سنانے کی کوشش نہ کرے۔

اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ عام بگاڑ کو دیکھ کر آدمی پیشگی یہ فیصلہ کر کے بیٹھ جائے کہ دعوت و تبلیغ یا تذکیر و نصیحت کچھ سودمند ہونے والی نہیں۔ لہٰذا یہ کام سرے سے کیا ہی نہ جائے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی ڈاکٹر لوگوں کی بدپرہیزیوں کو دیکھ کر اپنا مطب بند کر دے اور گھر میں بیٹھ جائے۔ یا محکمہ حفظانِ صحت یہ دیکھ کر کہ صحت کے معاملہ میں عام طور سے لوگ بے پرواواقع ہوئے ہیں اور مضر صحت اشیاء کا استعمال بڑھتا جا رہا ہے، سرے سے اپنے فرائض ہی ترک کر دے۔ جن لوگوں کی نظر انبیاء علیہم السلام کے طریقۂ دعوت پر ہو، وہ اس طرح کا فیصلہ ہرگز نہیں کر سکتے۔ اسلئے کہ انبیاء علیہم السلام کے طریقۂ دعوت میں حکمت اور موقع محل کی رعایت کی نشاندہی تو ضرور کی جا سکتی ہے، لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں پیش کیا جا سکتا کہ عام بگاڑ کے پیش نظر انہوں نے دعوت و اصلاح کا کام ہی موقوف کر دیا ہو۔ بلکہ وہ ہمیشہ مخالفتوں کے طوفان سے گذرتے رہے ہیں۔ اور اصلاح کا جو کام بھی انجام پا سکا ہے، موجوں کے تھپیڑے کھا کر ہی انجام دیا جا سکا ہے۔

یہاں سیاق کلام سے بھی واضح ہے کہ تذکیر عام تو ہونی ہی چاہئے۔ اسی صورت میں اس کو قبول کرنے والے بھی نکل آئیں گے اور اس سے گریز کرنے والے بھی۔

۱۲۔ یعنی جس شخص کے دل میں خدا کا خوف ہوگا وہ پیغمبر کی بات ضرور توجہ سے سنے گا۔ اور اُس نصیحت کو قبول کرے گا، جو پیغمبر پر خدا کی طرف سے قرآن کی شکل میں نازل ہوئی ہے۔

۱۳۔ یعنی جہنم میں نہ وہ جینے کا لطف اٹھا سکے گا۔ اور نہ موت ہی آئے گی کہ ساری کلفتوں کا خاتمہ کر دے۔ بلکہ وہ زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا رہے گا، جس کا انسان تصور ہی کرے تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور وہ اس سے اللہ کی پناہ مانگنے لگے۔

واضح رہے کہ یہاں ان لوگوں کی سزا کا حال بیان ہوا ہے، جو پیغمبر کی نصیحت سے گریز کریں۔ اور آخر وقت تک اس ''تذکیر'' کو قبول نہ کریں، جو

پیغمبر پر نازل ہوئی ہے۔

۱۴؎ پاکیزگی اختیار کرنے سے مراد قلب و ذہن کی پاکیزگی بھی ہے اور اخلاق و اعمال کی پاکیزگی بھی۔ قلب و ذہن کی پاکیزگی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی شرک اور کفر و الحاد کی آلودگی سے اپنے کو پاک کرلے۔ اور خدا و آخرت پر ایمان لے آئے۔ اور اخلاق و عمل کی پاکیزگی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی برائیوں کو چھوڑ دے اور نیک کام کرے۔

۱۵؎ اپنے رب کا نام لینے سے مراد محض رسماً نام لینا نہیں۔ کیونکہ اس طرح کا نام تو مشرک بھی لیتے ہیں اور کافر بھی۔ بلکہ نام لینے سے مراد خدا کو دل سے اور حقیقی طور سے یاد کرنا ہے۔ نیز زبان سے صحیح نام کے ساتھ اس کا ذکر کرنا ہے۔

۱۶؎ ''اپنے رب کا نام لیا اور نماز پڑھی'' سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ نماز کا اصل محرک اللہ کی یاد ہے۔ یہ یاد ہی بندہ کو اس کی عبادت کے لئے آمادہ کرتی ہے۔ یہیں سے حقیقی نماز اور رسمی نماز کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ حقیقی نماز اللہ کی یاد کا نتیجہ ہوتی ہے اور اس کے اندر روح کی طرح سموئی ہوتی ہے۔ گویا اپنے رب کی یاد اسے عبادت کے لئے بے چین کرتی ہے اور وہ نماز ہی میں سکون پاتا ہے۔ بخلاف اس کے رسمی نماز ایک بوجھ اتارنے کا کام ہے۔ اسی لئے اس میں دل نہیں لگتا۔

نماز کا ذکر یہاں جس انداز سے ہوا ہے۔ اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں نماز کا کیا مقام ہے۔ یہ سورہ مکہ کے ابتدائی دور کی تنزیل ہے اور اس میں آخرت کی کامیابی کے لے جو اوصاف ضروری قرار دیئے گئے ہیں ان میں نماز بھی شامل ہے۔ اور شرعی احکام میں اسے اولیت حاصل ہے۔

واضح رہے کہ نماز (صلوٰۃ) کو یوگا (Yoga) سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔ کیوں کہ نماز خالصۃً اللہ کی عبادت ہے جب کہ یوگا مشرکانہ طرز کی ریاضت۔

۱۷؎ یعنی فلاح آخرت کی یہ راہ، جس پر چل کر آدمی اپنے ظاہر و باطن کو سنوارتا ہے، محض اس لئے تم لوگ اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں ہو کہ اصل اہمیت تمہاری نگاہ میں دنیا کی ہے نہ کہ آخرت کی۔ تم کو فکر ہے تو دنیا کی اور آسائش چاہتے ہو تو دنیا ہی میں۔ دنیا کا کوئی مفاد قربان کرنے کے لئے تیار نہیں ہو اور سمجھتے ہو کہ یہاں کے ''نقد'' فائدے حاصل کرنا ہی عقلمندی ہے۔

۱۸؎ یعنی دنیا کے مقابلہ میں آخرت اس لئے قابل ترجیح ہے کہ وہاں کی زندگی ہر لحاظ سے بہتر اور وہاں کی نعمتیں دنیا کی نعمتوں سے کہیں بڑھ کر ہیں۔ مزید برآں آخرت ہمیشہ باقی رہنے والی ہے جب کہ دنیا فانی ہے۔

۱۹؎ یعنی توحید و آخرت کی یہ تعلیم جو قرآن پیش کر رہا ہے کوئی نئی بات نہیں ہے، جو پہلی مرتبہ پیش ہوئی ہو۔ بلکہ اللہ کی طرف سے ہمیشہ یہی ہدایت نازل ہوتی رہی ہے۔ اور قدیم سے قدیم صحیفوں (آسمانی کتابوں) میں بے کم و کاست یہی تعلیم موجود رہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے پیرو اس تعلیم کو یا تو بھلا چکے یا اس میں انہوں نے بڑی حد تک تحریف کی۔ اس لئے قرآن کے ذریعہ پھر اس تعلیم کی تجدید کی جا رہی ہے۔

آسمانی کتابوں میں سب سے قدیم صحیفہ ابراہیم علیہ السلام کا ہے، لیکن وہ محفوظ نہیں رہا ہے۔ رہے موسیٰ علیہ السلام کے صحیفے تو ان سے مراد تورات ہے، جو اپنی اصل شکل میں تو موجود نہیں ہے۔ البتہ اس کے کچھ اجزاء عہد نامہ عتیق (Old Testament) کی پانچ کتابوں میں، جو پیدائش، خروج، احبار، گنتی اور استثناء کے نام سے پائی جاتی ہیں، دیکھے جا سکتے ہیں۔ خاص طور سے توحید کی تعلیم اب بھی ان میں واضح طور پر موجود ہے۔ مثلاً:

''میرے حضور تو غیر معبودوں کو نہ ماننا، تو اپنے لئے کوئی تراشی ہوئی مورت نہ بنانا'' (خروج ۲۰، ۳، ۴)

پھر خداوند تعالیٰ نے موسیٰ سے کہا، بنی اسرائیل کی ساری جماعت سے کہہ کہ تم پاک رہو۔ کیوں کہ میں جو خداوند تمہارا خدا ہوں پاک ہوں۔۔۔۔۔

تم بتوں کی طرف رجوع نہ ہونا اور نہ اپنے لئے ڈھالے ہوئے دیوتا بنانا۔'' (احبار ۱۹: ۱ تا ۴)

''تو خداوند اپنے خدا کا خوف ماننا۔ اس کی بندگی کرنا اور اس سے لپٹے رہنا اور اُسی کے نام کی قسم کھانا۔ وہی تیری حمد کا سزاوار ہے اور وہی تیرا خدا ہے۔ (استثناء ۱۰، ۲۰، ۲۱)

اور موسیٰ علیہ السلام نے دنیا سے رخصت ہوتے وقت بنی اسرائیل کو جمع کر کے جو گیت سنایا اس کا ایک اقتباس یہ ہے:

''کان لگاؤ اے آسمانو! اور میں بولوں گا۔ اور زمین میرے منھ کی باتیں سنے۔ میری تعلیم مینہ کی طرح برسے گی۔ میری تقریر شبنم کی مانند ٹپکے گی، جیسے نرم گھاس پر پھوار پڑتی ہو اور سبزی پر جھڑیاں۔ کیوں کہ میں خداوند کے نام کا اشتہار دوں گا تم ہمارے خدا کی تعظیم کرو۔۔۔۔۔۔ وہ وہی چٹان ہے۔ اس کی صنعت کامل ہے۔ کیونکہ اس کی سب راہیں انصاف کی ہیں۔ وہ وفادار خدا اور بدی سے مبّرا ہے۔ وہ منصف اور برحق ہے۔'' (استثناء ۳۲: ۱ تا ۴)

سورۂ الغاشیۃ

۸۸۔ الغاشیۃ

نام اس سورہ کی پہلی آیت میں قیامت کی ''عام اور ہمہ گیر مصیبت'' کے لئے غاشیہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔جس کی مناسبت سے اس سورہ کا نام ''الغاشیہ'' ہے۔

زمانۂ نزول یہ سورہ مکی ہے اور مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اس وقت نازل ہوئی ہوگی، جب دعوت وتبلیغ کا کام ابھی ابتدائی مرحلہ میں تھا۔

مرکزی مضمون جزا وسزا ہی ہے۔لیکن چھوٹے چھوٹے فقروں میں جنت ودوزخ کی تصویر کشی، ایسے مؤثر پیرایہ میں کی گئی ہے کہ پڑھنے والا، بشرطیکہ آنکھیں رکھتا ہو، اسی دنیا میں ان کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے۔

یہ سورہ سابق سورہ کا تکملہ ہے۔اس میں جنت ودوزخ کا ذکر اجمالاً تھا۔لیکن اس سورہ میں دونوں کا نقشہ پیش کر دیا گیا ہے۔اس لئے نماز میں سورۂ الاعلیٰ کے ساتھ سورۂ الغاشیہ بھی پڑھی جاتی ہے۔حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ اور عیدین کی پہلی رکعت میں سورۂ اعلیٰ پڑھتے، تو دوسری رکعت میں سورۂ الغاشیہ۔(مسلم کتاب الجمعہ)

نظم کلام آیت ۱ میں قیامت کی ہمہ گیر آفت کی خبر دی گئی ہے، تاکہ غفلت میں پڑے ہوئے انسان چونک جائیں۔

آیت ۲ تا ۷ میں ان لوگوں کا انجام بیان کیا گیا ہے جو قیامت کے منکر ہیں۔اور خدا کے حضور جوابدہی کا کوئی تصور نہیں رکھتے۔

آیت ۸ تا ۱۶ میں ان لوگوں کا انجام بیان کیا گیا ہے، جو قیامت پر یقین رکھتے ہیں۔اور خدا کے حضور جوابدہی کے تصور کے تحت زندگی گذارتے ہیں۔

آیت ۱۷ تا ۲۰ میں آفاق کی بعض نشانیوں کی طرف متوجہ کیا گیا ہے، جو خدا کی قدرت وحکمت پر دلالت کرتی ہیں۔اور ان پر غور کرنے سے قرآن کے اس بیان کی تائید ہوتی ہے کہ خدا قیامت کے برپا کرنے اور جنت ودوزخ والی دنیا پیدا کرنے پر قادر ہے۔اور ضروری ہے کہ جزا وسزا کا معاملہ پیش آئے۔

آیت ۲۱ تا ۲۶ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ آپ کا کام صرف یاددہانی اور نصیحت کرنا ہے۔حق کو زبردستی منوانے کی ذمہ داری آپ پر نہیں ڈالی گئی ہے۔لہٰذا جو لوگ آپ کی نصیحت سننے کے لئے تیار نہیں ہیں، ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرو۔آخر کار ان کو اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔اس وقت وہ ان سے حساب لے لے گا۔

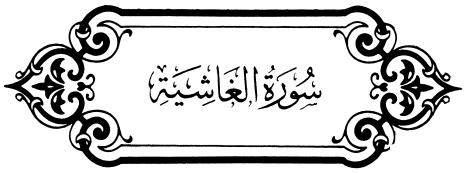

سُوْرَةُ الْغَاشِيَةِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ۝١

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۝٢

عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝٣

تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ۝٤

تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ۝٥

لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ۝٦

لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ۝٧

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ۝٨

لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ۝٩

فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۝١٠

لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً ۝١١

فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ۝١٢

فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ ۝١٣

وَّاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ۝١٤

وَّنَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ ۝١٥

وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ ۝١٦

۸۸۔ سُوْرَةُ الْغَاشِيَةِ

آیات: ۲۶

اللہ رحمٰن و رحیم کے نام سے

۱ کیا تمہیں ۱؎، چھا جانے والی آفت کی خبر پہنچی ہے؟ ۲؎

۲ کتنے چہرے ۳؎، اس روز رُسوا ہوں گے، ۴؎

۳ مشقت کرنے والے تھکے ماندے ہوں گے، ۵؎

۴ دہکتی آگ میں داخل ہوں گے، ۶؎

۵ کھولتے چشمہ کا پانی انہیں پلایا جائے گا۔ ۷؎

۶ ان کے لئے جھاڑ کانٹے کے سوا کوئی کھانا نہیں ہوگا، ۸؎

۷ جو نہ موٹا کرے گا اور نہ بھوک ہی کو دفع کرے گا۔ ۹؎

۸ کتنے چہرے اس روز بارونق ہوں گے، ۱۰؎

۹ اپنی کوششوں پر شاداں، ۱۱؎

۱۰ بلند پایہ جنت میں، ۱۲؎

۱۱ جہاں کوئی لغو بات نہ سنیں گے۔ ۱۳؎

۱۲ اس میں چشمے بہہ رہے ہوں گے۔ ۱۴؎

۱۳ اس کے اندر اونچے تخت ہوں گے، ۱۵؎

۱۴ اور پیالے ہوں گے قرینہ سے رکھے ہوئے، ۱۶؎

۱۵ اور گاؤ تکئے قطار کی شکل میں لگے ہوئے،

۱۶ اور قالین بچھے ہوئے۔ ۱۷؎

۱۔ خطاب گو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن مقصود عام انسانوں کو آگاہ کرنا ہے۔

۲۔ چھا جانے والی آفت (الغاشیہ) سے مراد قیامت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت کا ظہور ایک ہمہ گیر آفت کی شکل میں ہوگا، جو سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیگا۔ یہاں اس بات کو سوالیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے تا کہ سننے والے چونک جائیں۔ اور آگے جو احوالِ قیامت پیش کئے جا رہے ہیں ان کو بغور سنیں۔

۳۔ چہرے (وجُوہ) سے مراد اشخاص ہیں۔ چونکہ انسان کی اندرونی کیفیت کا اظہار چہرے سے ہوتا ہے اور اس کی شخصیت بھی اسی سے پہچانی جاتی ہے۔ اس لئے یہاں اشخاص کے لئے چہروں (وجُوہ) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

۴۔ یہ ان لوگوں کے حال کا بیان ہے، جو جزا و سزا کا انکار کرتے رہے۔ اور اس تصور کے تحت زندگی گذارتے رہے کہ نہ انہیں خدا کے حضور حاضر ہونا ہے، اور نہ اپنے کئے کا حساب پیش کرنا ہے۔

۵۔ یعنی قیامت کے دن منکرین کو سخت مشقت کے کام کرنے پڑیں گے جن سے تھک کر وہ نڈھال ہو جائیں گے۔ مثلاً قبروں سے اٹھتے ہی اپنے موقف تک دوڑنے، پیشی کے انتظار میں سالہا سال تک سخت گرمی میں بھوکے پیاسے کھڑے ہونے، طوق پہننے اور زنجیریں گھسیٹنے جیسے کام۔ جن لوگوں نے دنیا میں شرعی پابندیوں سے اپنے آپ کو آزاد کر رکھا تھا اور نماز جیسی عبادت کو وہ بوجھل خیال کرتے رہے۔ ان کی اس سہولت پسندی اور تن آسانی کا ٹھیک ٹھیک بدلہ یہی ہوگا کہ وہ قیامت کے دن تھکا دینے والے کام کریں اور ''قید بامشقت'' کی سزا بھگتیں۔

۶۔ یعنی قیامت کے موقف سے جب یہ منکرین لوٹیں گے تو سیدھے جہنم رسید ہوں گے، جس کی آگ بھڑک رہی ہوگی۔

۷۔ کھولتا ہوا پانی اس لئے کہ جب انہوں نے خدا اور آخرت سے بے نیاز ہو کر زندگی گذاری۔ اور اس کے انعام کا اپنے آپ کو امیدوار نہیں بنایا، تو وہ بجا طور پر اس بات کے مستحق ہوئے کہ ان کی تواضع آخرت میں کھولتے ہوئے پانی سے کی جائے۔

۸۔ یعنی کھانے کے لئے انہیں غذائیت رکھنے والی اور ذائقہ دار کوئی چیز نہیں ملے گی۔ البتہ جھاڑ کانٹے اور اسی طرح زقوم اور پیپ وغیرہ انہیں ضرور کھانا پڑیں گے۔ جو ظاہر ہے غذا کا کام نہیں دے سکتے۔

یہ بدلہ بھی ٹھیک ان کے عمل کے مطابق ہوگا۔ کیوں کہ انہوں نے خدا سے ملنے کا انکار کر کے دنیا میں کانٹے ہی بوئے تھے، اس لئے انہوں نے جو بویا تھا وہی انہیں کھانے کے لئے ملے گا۔

۹۔ یعنی ان جھاڑ کانٹوں میں سرے سے غذائیت ہی نہیں ہوگی۔ اس لئے جسم کو نہ تو انائی حاصل ہو سکے گی اور نہ بھوک ہی مٹ سکے گی۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں جسم کو تقویت پہنچانے اور بھوک کو مٹانے کے لئے طرح طرح کی ذائقہ دار غذائیں بخشی تھیں۔ لیکن جب انہوں نے ان نعمتوں کو پانے کے بعد بھی اپنے رب کی ناشکری کی تو وہ اسی لائق ٹھہرے کہ جھاڑ کانٹے کھائیں۔

واضح رہے کہ متن میں لفظ ''ضریع'' استعمال ہوا ہے جو ایک خاردار اور زہریلی جھاڑی کا نام ہے۔

۱۰۔ اب ان لوگوں کا حال بیان کیا جا رہا ہے جو آخرت پر ایمان لائے اور خدا کے حضور جواب دہی کے اندیشہ سے ذمہ دارانہ زندگی گذارتے رہے۔

۱۱۔ یعنی اپنی کوششوں کے بہترین نتائج دیکھ کر وہ خوش ہوں گے کہ اچھا ہوا، انہوں نے آخرت کو مقصود بنا کر زندگی بسر کی۔ اور دنیا پرستی میں مبتلا نہیں ہوئے۔

۱۲۔ یعنی وہ ایسے باغ میں ہوں گے جو بلندی پر بھی ہوگا اور اعلیٰ درجہ کا بھی۔

۱۳؎ یعنی جنت کی سوسائٹی اس قدر پاکیزہ اور وہاں کی مجلسیں اتنی شائستہ ہوں گی کہ نہ تو کوئی شخص ناشائستہ بات اپنی زبان سے نکالے گا، اور نہ کسی کو بیہودہ بات سننے کیلئے سمع خراشی کرنا ہوگی۔ دنیا کے موجودہ ماحول سے جہاں فحش باتوں اور لغو گانوں سے اپنے کانوں کو محفوظ رکھنا ممکن نہیں رہا، جنت کا ماحول بالکل مختلف اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کا حامل ہوگا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہوگی جو پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو نصیب ہوگی۔

۱۴؎ جنت میں چشموں کا رواں ہونا ایک تو اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس کی سرسبزی و شادابی کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ اور دوسرے اس بات کی طرف کہ پانی اور دوسرے اعلیٰ قسم کے مشروبات وہاں وافر مقدار میں مہیا ہوں گے۔

۱۵؎ اونچے اور شاندار تخت شاہانہ زندگی کی علامت ہیں اور اہل جنت کو ایسی ہی زندگی نصیب ہوگی۔

۱۶؎ یعنی پیالے یا گلاس سامنے رکھے ہوئے ہوں گے۔ انہیں جنت کے مشروبات پینے کے لئے کوئی زحمت کرنا نہیں ہوگی۔

۱۷؎ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اہل جنت کی زندگی کیسی آسائش کی زندگی ہوگی۔ اور ان کے لئے کیسا وافر اور نفیس سامانِ آرائش وہاں موجود ہوگا۔

اوپر کی آیات میں جنت کی جو تصویر پیش کی گئی ہے اس سے جنت کا صحیح اور صاف ستھرا تصور قائم ہوتا ہے۔ اور اتنی بات اس کو حاصل کرنے کی اُمنگ پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔ رہی اس کی اصل حقیقت تو عالمِ آخرت کی چیزوں کو ہم مادی پیمانوں سے ناپ نہیں سکتے۔ اس لئے اس پر بحثیں کھڑی کرنا بالکل بے سود ہے۔

کیا یہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے پیدا کئے گئے ہیں؟ اور آسمان کو کہ کیسا بلند کیا گیا ہے؟ اور پہاڑوں کو کہ کس طرح کھڑے کر دئے گئے ہیں؟ اور زمین کو کہ کس طرح بچھائی گئی ہے؟ تو (اے پیغمبر!) تم نصیحت کرو، کہ تمہارا کام بس نصیحت کرنا ہے۔ (القرآن)

أَفَلَا يَنظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ﴿١٧﴾ وقفة

١٧ کیا یہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے پیدا کئے گئے ہیں؟

وَإِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ﴿١٨﴾ وقفة

١٨ اور آسمان کو کہ کیسا بلند کیا گیا ہے؟

وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ﴿١٩﴾ وقفة

١٩ اور پہاڑوں کو کہ کس طرح کھڑے کر دئے گئے ہیں؟

وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ﴿٢٠﴾

٢٠ اور زمین کو کہ کس طرح بچھائی گئی ہے؟١٨؎

فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ ﴿٢١﴾

٢١ تو (اے پیغمبر!) تم نصیحت کرو، کہ تمہارا کام بس نصیحت کرنا ہے۔

لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ ﴿٢٢﴾

٢٢ ان پر جبر کرنا نہیں ہے،١٩؎

إِلَّا مَن تَوَلَّىٰ وَكَفَرَ ﴿٢٣﴾

٢٣ مگر جو منہ موڑے گا٢٠؎، اور کفر کرے گا، ٢١؎

فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ ﴿٢٤﴾

٢٤ تو اللہ اس کو بڑا عذاب دے گا۔٢٢؎

إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ ﴿٢٥﴾

٢٥ بے شک ہماری ہی طرف ہے ان کی واپسی، ٢٣؎

ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُم ﴿٢٦﴾

٢٦ پھر ہمارے ہی ذمہ ہے ان سے حساب لینا۔٢٤؎

۱۸؎ اوپر قیامت اور جنت و دوزخ کا جو ذکر ہوا، اس کا انکار کرنے والوں کو یہاں دعوت فکر دی گئی ہے۔ اور اس سلسلہ میں گرد و پیش کی چیزوں کی طرف انہیں متوجہ کیا گیا ہے۔ صحرائے عرب میں دوران سفر ان کی نگاہ سب سے پہلے اونٹ پر پڑتی تھی۔ اس لئے انہیں سب سے پہلے اس پر غور کرنے کی دعوت دی گئی، کہ کیا یہ دیکھتے نہیں کہ یہ جانور کن خصوصیات کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے؟ جن خصوصیات کی صحرائی زندگی کے لئے ضرورت تھی ٹھیک ان خصوصیات کے ساتھ اونٹوں کا پیدا کیا جانا، کیا اللہ کی صفت قدرت، ربوبیت اور حکمت پر دلالت نہیں کرتا؟

صحرا میں اونٹ پر سفر کرنے والوں کو آسمان، پہاڑ، اور زمین نظر آتے ہیں۔ اس لئے ان سے کہا گیا کہ انہی چیزوں پر غور کریں کہ کیا یہ بلند آسمان اللہ کی عظیم قدرت کی شہادت نہیں دیتا؟ اور کیا یہ پہاڑ جو زمین پر کھڑے کر دئے گئے ہیں اس کی محکم کاریگری اور صناعی کا نشان نہیں ہیں؟ اور کیا یہ زمین جسے اس طرح بچھا دیا گیا ہے کہ وہ اربوں انسانوں کے بسنے کے قابل ہوگئی، اُس کی ربوبیت اور حکمت پر دلالت نہیں کرتی؟ اگر یہ سب کچھ صحیح ہے ۔۔۔۔ اور عقل کہتی ہے کہ یہی بات صحیح ہے۔ تو پھر اس خدا کے لئے قیامت کو برپا کرنا، انسان کو دوبارہ پیدا کرنا اور جنت و دوزخ والی دنیا بنا دینا کیا مشکل ہے؟ اور کیا اس کی ربوبیت کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ وہ ایک دن ایسا لائے؟ جس میں وہ اپنے بندوں سے حساب لے کہ انہوں نے اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھا کر اس کی شکر گذاری کی یا ناشکری؟ اور کیا یہ بات اس کی حکمت کے خلاف نہ ہوگی کہ انسان جیسی اعلیٰ مخلوق کی کوئی غایت نہ ہو؟ اور اس کی تخلیق کے پیچھے سرے سے کوئی منصوبہ اور کوئی اسکیم ہی نہ ہو؟

۱۹؎ یعنی پیغمبر کا کام تذکیر و دعوت اور انذار و تبلیغ ہے۔ لوگوں سے زبردستی بات منوا لینے کا کام پیغمبر کے سپرد نہیں کیا گیا ہے۔

۲۰؎ منہ موڑنا یہ ہے کہ آدمی نصیحت کی بات سننا پسند نہ کرے، قرآن کی تذکیر اس پر گراں ہو اور جب یاد دہانی کی کوئی بات اس کے سامنے آجائے تو وہ اس سے عدم دلچسپی کا اظہار کرے یا کترا کر نکل جائے۔

۲۱؎ کفر یہ ہے کہ آدمی قرآن کی تذکیر کو قبول نہ کرے اور اس کی ہدایت اور تعلیمات کو ماننے سے انکار کر دے۔

۲۲؎ یعنی منکرین پر آخرت میں اللہ کا عذاب ایسا زبردست ہوگا کہ اس کا مقابلہ دنیا کی بڑی سے بڑی سزا سے نہیں کیا جا سکتا۔ مگر قرآن کی اس واضح تنبیہ کے باوجود جو لوگ کفر کی راہ اختیار کریں انہیں اس انجام کو پہنچنے سے کون بچا سکتا ہے!

۲۳؎ اللہ کی طرف واپسی کا مطلب یہ ہے کہ سب کو ایک دن، اسی کے حضور حاضر ہونا ہے کسی اور کے حضور نہیں۔ پھر یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ آدمی اس فکر ہی سے بے نیاز ہو جائے کہ اسے خدا کے حضور حاضر ہونا ہے۔

۲۴؎ یعنی قیامت کے دن جب اللہ کے حضور تمام لوگوں کی حاضری ہوگی، تو وہ ہر ایک سے حساب لے گا۔ اس وقت ان لوگوں کو جنہوں نے پیغمبر کی نصیحت پر کان نہیں دھرا، اور قرآن کی رہنمائی کو قبول کرنے سے انکار کرتے رہے سخت جواب دہی کرنا ہوگی۔

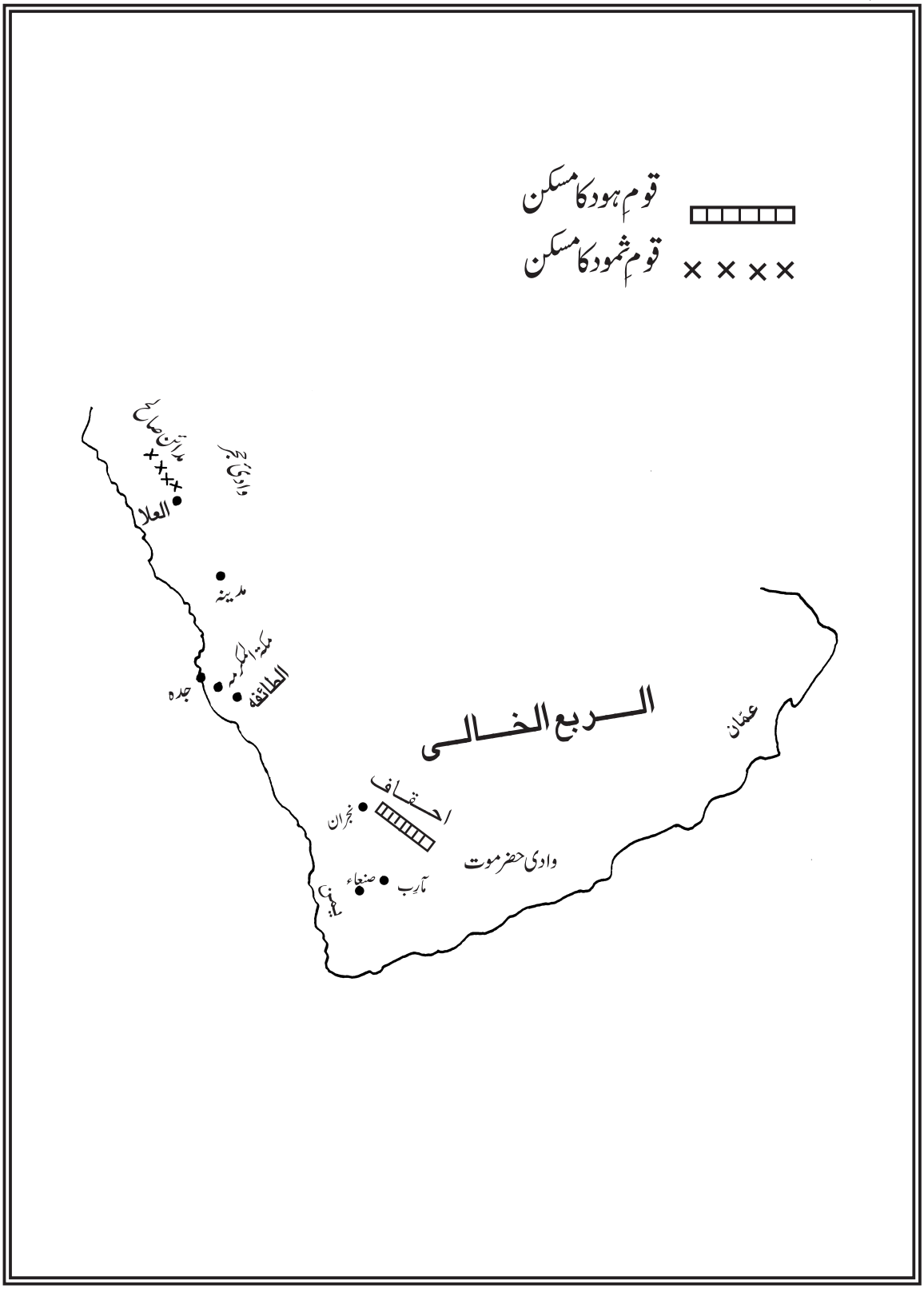
قومِ ہود کا مسکن
قومِ ثمود کا مسکن
مدائن صالح
وادی حجر
العلا
مدینہ
مکۃ المکرمہ
الطائفہ
جدہ
الربع الخالی
عمان
احقاف
نجران
وادی حضرموت
مآرب
صنعاء
یمن

۸۹۔ الفجر

نام سورہ کا آغاز وَالْفَجْرِ (قسم ہے فجر کی) سے ہوا ہے۔اسی مناسبت سے اس کا نام ''الفجر'' ہے۔

زمانۂ نزول مکی ہے اور مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اس وقت کی تنزیل ہے، جب اہل مکہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تذکیر کا اثر قبول کرنے کے، بجائے سرکشی اور ظلم وفساد کا رویہ اختیار کیا تھا۔

مرکزی مضمون جزا وسزا ہے۔خاص طور سے سزا کے پہلو کو نمایاں طور سے پیش کیا گیا ہے، تاکہ جو لوگ دنیا پرستی میں مگن ہیں وہ ہوش میں آئیں۔

نظم کلام آیت ۱ تا ۵ میں رات اور دن کے طبعی احوال کو روزِ جزا کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے۔

آیت ۶ تا ۱۴ میں تاریخ کی بعض عظیم قوموں کے عبرت ناک انجام کو اس بات کی تائید میں پیش کیا گیا ہے کہ اس کائنات کا، فرمانروا، افراد اور قوموں پر نظر رکھے ہوئے ہے۔اور وہ ایک دن ضرور ان سے محاسبہ کرے گا۔

آیت ۱۵ تا ۲۰ میں انسان کے غلط طرزِ عمل خاص طور سے، کمزوروں کے حقوق غصب کرنے پر سخت گرفت کی گئی ہے۔اور واضح کیا گیا ہے کہ یہ طرزِ عمل نتیجہ ہے انکارِ آخرت کا۔

آیت ۲۱ تا ۳۰ میں عدالت خداوندی کی تصویر پیش کرتے ہوئے منکرین ومؤمنین کا انجام بیان کیا گیا ہے۔

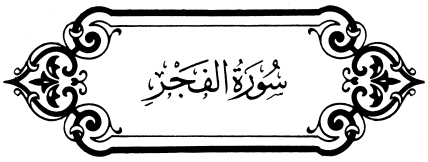

سُوْرَةُ الْفَجْرِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْفَجْرِ ﴿١﴾

وَلَيَالٍ عَشْرٍ ﴿٢﴾

وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ﴿٣﴾

وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ﴿٤﴾

هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ﴿٥﴾

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ﴿٦﴾

اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ﴿٧﴾

الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ﴿٨﴾

وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ﴿٩﴾

وَفِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ ﴿١٠﴾

الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ﴿١١﴾

فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ ﴿١٢﴾

فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ﴿١٣﴾

اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ﴿١٤﴾

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ
فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ﴿١٥﴾

۸۹۔ سُوْرَةُ الْفَجْرِ

آیات: ۳۰

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ قسم ہے ۱؎ فجر کی، ۲؎

۲ اور دس راتوں کی، ۳؎

۳ اور جفت اور طاق کی، ۴؎

۴ اور رات کی جب وہ رخصت ہو رہی ہو۔ ۵؎

۵ کیا اس میں ایک عقلمند کے لئے کوئی قسم نہیں ہے؟ ۶؎

۶ تم نے نہیں دیکھا ۷؎ تمہارے رب نے کیا معاملہ کیا عاد کے ساتھ! ۸؎

۷ بلند عمارتوں والے ۹؎ ارم کے ساتھ! ۱۰؎

۸ جن کے مانند کوئی (قوم) کسی ملک میں پیدا نہیں کی گئی تھی۔ ۱۱؎

۹ اور ثمود کے ساتھ ۱۲؎، جو وادی میں ۱۳؎، چٹانیں تراشا کرتے تھے۔ ۱۴؎

۱۰ اور میخوں والے فرعون کے ساتھ! ۱۵؎

۱۱ ان لوگوں نے ملکوں میں سر اٹھا رکھا تھا۔

۱۲ اور ان میں بہت فساد مچا رکھا تھا۔ ۱۶؎

۱۳ تو تمہارے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا۔ ۱۷؎

۱۴ واقعی تمہارا رب گھات میں رہتا ہے۔ ۱۸؎

۱۵ مگر انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس کا رب اس کی آزمائش اس طرح کرتا ہے کہ اس کو عزت و نعمت بخشتا ہے، تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت بخشی۔ ۱۹؎

۱؎ قسم کی تشریح کے لئے ملاحظہ ہو سورۂ تکویر نوٹ ۱۴؎۔

۲؎ فجر سے مراد وہ وقت ہے جب رات کی تاریکی میں سے، دن کی روشنی مشرقی افق پر نمودار ہوتی ہے۔اس کا دوسرا نام صبح صادق ہے جسے اردو میں ہم پَو پھٹنا کہتے ہیں۔فجر کا وقت طلوع آفتاب تک رہتا ہے، جب کہ صبح کا اطلاق طلوع آفتاب کے بعد کے وقت پر بھی ہوتا ہے۔

۳؎ دس راتوں سے مراد قمری ماہ کی دس راتیں ہیں۔اور فجر کی مناسبت سے درمیانی دس راتیں یعنی گیارہویں تا بیسویں شب مراد لینا زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔کیوں کہ یہ راتیں چاند سے روشن رہتی ہیں۔

۴؎ سلسلۂ کلام کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یہاں جفت اور طاق سے مراد جفت اور طاق راتیں ہی لی جاسکتی ہیں۔کیوں کہ رات کا ذکر اس سے پہلے بھی ہوا ہے اور اس کے بعد بھی۔راتیں کسی مہینہ میں جفت عدد ہوتی ہیں اور کسی میں طاق عدد۔یعنی کوئی مہینہ ۳۰ راتوں کا ہوتا ہے اور کوئی ۲۹ راتوں کا۔

۵؎ رات کے رخصت ہونے سے مراد وہ وقت ہے، جب تاریکی ختم ہونے اور پَو پھٹنے کو ہوتی ہے۔

۶؎ یعنی کیا ان چیزوں میں رہنمائی کا کوئی سامان موجود نہیں ہے؟ اور کیا ایک آدمی پر جو عقل و ہوش سے کام لے آسمان پر ظاہر ہونے والے، ان آثار سے قرآن کے بیان کی صداقت روشن نہیں ہوتی؟ یہ سوال اثبات کے لئے اور بات کو مؤکد کرنے کیلئے ہے۔یہاں شب و روز کے نظام پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے، جس کا مشاہدہ انسان روزانہ کرتا ہے۔اس کا آغاز فجر سے ہوتا ہے اور اختتام رات کے رخصت ہوجانے پر۔فجر، رات کی تاریکی کو چاک کر کے نمودار ہوتی ہے، جس وقت صبح کی سفید دھاری افق پر نمایاں ہوجاتی ہے تو وہ منظر بہت عجیب ہوتا ہے۔اسی طرح ہر ماہ کی درمیانی دس راتیں جو چاند کے نور سے روشن ہوتی ہیں، انسان کے قلب و ذہن پر خاص اثر ڈالتی ہیں۔پھر ہر مہینہ کا اختتام یا تو ۳۰ راتوں پر ہوتا ہے یا انتیس راتوں پر۔اس میں کبھی کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔اور رات کے جب رخصت ہونے کا وقت آجاتا ہے، تو وہ خاموشی کے ساتھ اپنی بساط لپیٹ دیتی ہے۔اور اس طرح رخصت ہوجاتی ہے کہ گویا وہ رخصت ہونے ہی کے لئے آئی تھی۔اور اس کے رخصت ہوتے ہی وہ بزم بھی بے رونق ہوجاتی ہے جو اس نے سجائی تھی۔

رات دن مشاہدہ میں آنے والے یہ آثار کیا کسی مدبّر ہستی کا پتہ نہیں دیتے؟ شب و روز کا یہ عجیب و غریب نظام اور اس میں کمال درجہ کی باقاعدگی کس طرح پیدا ہوسکتی تھی، اگر اس کے پیچھے ایک زبردست قدرت اور حکمت رکھنے والی ہستی کا ہاتھ نہ ہوتا؟ پس یہ مشاہدہ انسان کو جس نتیجہ پر پہنچاتا ہے وہ یہ ہے کہ یقیناً ایک مدبّر ہستی ہے، جس کے اشارہ پر کائنات کا یہ سارا نظام کمال درجہ کی باقاعدگی کے ساتھ نہایت محکم طریقہ پر چل رہا ہے۔اور جب وہ ہستی مدبّر ہے تو اس کی بنائی ہوئی دنیا بے غایت کیسے ہوسکتی ہے؟ اور اس کا پیدا کردہ انسان شتر بے مہار کس طرح ہوسکتا ہے؟ ضروری ہے کہ اس دنیا کی ایک غایت ہو اور انسان کی تخلیق کے پیچھے کوئی منصوبہ ہو۔قرآن اس غایت کی نشاندہی کرتا ہے۔اور خدائی منصوبہ کو کھول کر بیان کرتا ہے۔اس کے بیان کے مطابق دنیا کی غایت آخرت ہے۔اور انسانی زندگی کیلئے خدائی منصوبہ یہ ہے کہ اسے امتحان سے گذارا جائے۔اور جو اس امتحان میں کھرا ثابت ہو اُسے آخرت کی لازوال نعمتوں سے نوازا جائے۔اور جو کھوٹا ثابت ہو اسے آگ میں جھونک دیا جائے۔قرآن کا یہ بیان دراصل اس حقیقت کی شرح ہے جو شب و روز کے نظام میں اور پوری کائنات میں اشارے کنایہ کی زبان میں بول رہی ہے۔اور قرآن کے بیان کا اس حقیقت سے جو کائنات میں کارفرما ہے اس درجہ ہم آہنگ ہونا اس کی صداقت کا بین ثبوت ہے۔

فجر کی قسم کا ایک اور پہلو بھی ہے۔فجر کا وقت روزانہ ظہورِ قیامت کی یاددہانی کراتا ہے۔جس طرح رات کی تاریکی کا پردہ چاک کر کے فجر نمودار ہوتی ہے، اسی طرح دنیا پر چھائی ہوئی تاریکی کا پردہ چاک کر کے قیامت کی فجر نمودار ہوگی، اور جس طرح انسان صبح نیند سے بیدار ہوتا ہے۔اسی طرح قیامت کی صبح کا ظہور ہوتے ہی اٹھ بیٹھے گا۔اور محسوس کرے گا کہ ابھی سویا تھا اور ابھی جاگ گیا۔اسی حقیقت کی طرف وہ مسنون دعا متوجہ کرتی ہے جس کو صبح

بیدار ہوتے ہی پڑھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَمَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْہِ النَّشُوْرُ۔ (مسلم کتاب الذکر)

''شکر اللہ کا جس نے موت کے بعد ہمیں زندگی بخشی اور اسی کی طرف اٹھ کھڑے ہونا ہے۔''

۷۔ ''تم نے نہیں دیکھا'' کیا تم نے غور نہیں کیا؟'' کے مفہوم میں ہے۔ جس طرح ہم بولتے ہیں ''تم نے نہیں دیکھا ہٹلر کا کیا انجام ہوا'' جب کہ ہٹلر کے انجام کے ہم عینی شاہد نہیں ہوتے، بلکہ اس کو ایک تاریخی واقعہ کے طور پر جانتے ہیں۔ ایسے موقع پر کہنے والے کا منشا یہ ہوتا ہے کہ یہ واقعہ، جو تاریخی طور پر ثابت ہے تمہارے لئے لائق غور ہے اور اس سے تمہیں سبق حاصل کرنا چاہئے۔

۸۔ عاد ایک قوم کا نام ہے جو جنوبی عرب کے ریگستانی صحرا، ربع خالی میں، احقاف کے علاقہ میں جو یمن اور حضر موت کے درمیان ہے آباد تھی۔ اس کا زمانہ نوح علیہ السلام کے بعد اور ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کا ہے۔ یعنی تقریباً ۳ر ہزار سال قبل مسیح کا۔

۹۔ ''ذات العماد'' اس لئے کہا گیا کہ وہ بڑی بڑی بلند عمارتیں تیار کرتے تھے۔ اور یہ طریقہ انہوں نے کسی حقیقی تمدنی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے نہیں، بلکہ محض قومی یادگار کھڑی کرنے اور شوقِ نمائش پورا کرنے کی غرض سے اختیار کیا تھا۔ ان کے اس آرٹ میں اسراف بھی تھا اور دنیا پرستی کی جڑیں مضبوط کرنے کا سامان بھی۔

۱۰۔ عاد کو اِرم کی طرف اس لئے منسوب کیا گیا ہے کہ یہ لوگ سامی نسل (Semetic Race) کی اس شاخ سے تعلق رکھتے تھے، جو اِرم بن سام بن نوح سے چلی۔ اِرم کا ذکر بائبل میں موجود ہے:

''بنی سم (سام) یہ ہیں۔۔۔ اور اِرام۔ اور بنی اِرام یہ ہیں عُوض۔۔۔'' (پیدائش : ۱۰: ۲۲) بائبل کے اس بیان میں لفظ اِرام، اِرم ہی کا تلفظ ہے۔

۱۱۔ یعنی زور و قوت اور شان و شوکت کے لحاظ سے ان کے زمانہ میں کوئی قوم ان کی برابری کی نہیں تھی۔ اور ان سے پہلے بھی اس شان کی کوئی قوم نہیں گذری تھی۔

عاد سرزمین عرب کی سب سے قدیم قوم ہے، جو طوفانِ نوح کے بعد اپنی تعمیری ترقی اور قوت و اقتدار کے ساتھ اُبھری تھی۔ اور اپنی ان مادی خصوصیات کی بنا پر دنیا کی ایک ممتاز اور بے نظیر قوم تھی۔

۱۲۔ عاد کے بعد مادی ترقی اور دنیوی شان و شوکت کے لحاظ سے، جو قوم اُبھری اس قوم کا نام ثمود تھا۔ اسکا بھی زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کا ہے۔

۱۳۔ وادی سے مراد وادی القریٰ ہے جو حجاز اور شام کے درمیان واقع ہے۔ اس وادی کا اہم ترین مقام ''حجر'' تھا جس کو اب مدائن صالح کہتے ہیں۔ اور جو مدینہ سے شمال میں تقریباً ۱۸۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے، یہ علاقہ ثمود کا مسکن تھا۔

۱۴۔ ثمود چٹانوں کو تراش کر گھر بنا لیتے تھے۔ اس فن تعمیر میں انہیں بڑی مہارت تھی۔ اور اس میں ان کا انہماک شوقِ تعمیر کو پورا کرنے کے لئے تھا۔ اس طرح انہوں نے تعمیرات کے میدان میں شاندار ترقی کی تھی۔ اور اس ترقی کے زیر اثر یہ سمجھ رکھا تھا کہ وہ دنیا میں ہر طرح سے محفوظ ہیں۔

۱۵۔ میخوں والا سے مراد لاؤ لشکر والا ہے۔ فرعون نے اپنے ملک کی حفاظت کے لئے مستقل فوج قائم کی تھی۔ جب کہ اُس زمانہ میں مستقل طور سے فوج رکھنے کا رواج نہ تھا، بلکہ جب جنگ کی ضرورت پیش آجاتی، وقتی طور سے اس کا انتظام کرلیا جاتا۔ فوج چونکہ خیموں میں رہتی تھی اور خیمہ میخیں ٹھونک

کر قائم کیا جاتا ہے اس لئے، اس مناسبت سے یہ الفاظ لاؤلشکر والا کے معنیٰ میں کنایۃً استعمال ہوئے ہیں۔

۱۶؎ یعنی ان قوموں نے ایک شاندار تمدن کے وسائل اور اقتدار پا کر بہت غلط روش اختیار کی۔ خدا سے بے خوف اور آخرت سے بے پروا ہو کر وہ گھمنڈ میں مبتلا ہو گئیں اور انہوں نے سرکشی کا رویہ اختیار کیا، جس کے نتیجہ میں ان میں ہر طرح کا بگاڑ پیدا ہوا۔

۱۷؎ یعنی جب یہ قومیں سرکشی اور بگاڑ کی راہ پر چل پڑیں اور پیغمبروں کی تنبیہات کے باوجود اصلاح کے لئے آمادہ نہیں ہوئیں، تو اللہ تعالیٰ کا قانونِ تعذیب حرکت میں آیا۔ اور اس نے اس طرح ان کو گرفت میں لیا کہ ان کی ساری مادی ترقی، اور ان کی ساری شان و شوکت مٹی میں مل گئی۔ نہ بلند عمارتیں انہیں ذلت کی موت مرنے سے بچا سکیں اور نہ چٹانوں میں تراشے ہوئے مکانات ان کی حفاظت کر سکے۔ اسی طرح فرعون کا لاؤلشکر اس کو سمندر میں غرق ہونے سے نہیں بچا سکا، بلکہ وہ لشکر سمیت ڈوب مرا ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ کسی شاعر نے کہا ہے۔ ع

ہم تو ڈوبے ہیں صنم تجھ کو بھی لے ڈوبیں گے

ان قوموں پر جو عذاب آیا اس کی تفصیلات سورۂ اعراف، سورۂ یونس، سورۂ ہود، سورۂ حجر اور دیگر صورتوں میں بیان ہوئی ہیں۔

۱۸؎ اوپر جن تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا، وہ شہادت دیتے ہیں کہ یہ دنیا اندھیر نگری نہیں ہے۔ اور انسان کا خالق اس کو پیدا کر کے اس سے بے تعلق نہیں ہوا ہے، بلکہ وہ ہر شخص اور ہر قوم کی نگرانی کر رہا ہے اور ان سب کی باگ اس کے ہاتھ میں ہے۔ وہ سرکش اور مفسد قوموں کو ڈھیل ضرور دیتا ہے تا کہ وہ سنبھلنا چاہیں تو سنبھلیں، لیکن یہ ڈھیل ایک وقت خاص تک کے لئے ہی ہوتی ہے۔ اسکے بعد اچانک خدا کے عذاب کا کوڑا اُن پر برستا ہے اور وہ بُرے انجام سے دوچار ہو جاتی ہیں۔

تاریخ کی یہ شہادت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ دنیا کھیل تماشا نہیں، بلکہ ایک امتحان گاہ ہے، جس میں افراد کا بھی امتحان ہو رہا ہے اور قوموں کا بھی۔ اور ان کا رب ان کے ساتھ عدل و حکمت کے ساتھ معاملہ کر رہا ہے۔ اور وہ مجرموں کو سزا دینے پر پوری طرح قادر ہے۔ اور جب دنیا امتحان گاہ قرار پائی تو لازم آتا ہے کہ ایک روز جزا و سزا کا آئے۔ پس قرآن کا یہ دعویٰ کہ قیامت کا ظہور اور جزا و سزا کا وقوع، ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے، اور تاریخ کی شہادت سے بھی ثابت ہے۔

۱۹؎ یہاں انسان کا جو حال بیان کیا گیا ہے اس سے اس مغالطہ کو دور کرنا مقصود ہے، جس میں دنیا پرست لوگ مبتلا ہوتے ہیں۔ مال و دولت، جاہ و اقتدار اور مادی نعمتوں کا ملنا ان کے نزدیک معیارِ عزت ہے۔ اور جس کو مادی نعمتوں کی فراخی حاصل ہوتی ہے، وہ یہ سمجھتا ہے کہ خدا کی نظر میں وہ اچھا ہے۔ اسی لئے وہ اس کی عزت افزائی کا سامان کر رہا ہے اور یہ خام خیالی اسے سرکشی پر آمادہ کرتی ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ جس کو بھی یہ چیزیں عطا کرتا ہے آزمائش کے لئے عطا کرتا ہے کہ دیکھے وہ ان نعمتوں کو پا کر اپنے رب کا شکر گذار اور فرمانبردار بندہ بنتا ہے اور بندوں کے حقوق کو ادا کرتا ہے یا اس کا ناشکرا، مغرور اور بندوں کے حقوق کو ٹھکرانے والا بنتا ہے، رہی حقیقی عزت و سرفرازی تو وہ امتحان میں کامیابی کے بعد ہی حاصل ہو سکتی ہے۔

وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ﴿۱۶﴾

۱۶ اور جب اس کی آزمائش اس طور سے کرتا ہے کہ اس کا رزق اس پر تنگ کر دیتا ہے، تو کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کیا۔ ۲۰

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ﴿۱۷﴾

۱۷ نہیں ۲۱۔ بلکہ تم لوگ یتیموں کی قدر نہیں کرتے، ۲۲

وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿۱۸﴾

۱۸ اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ایک دوسرے کو ترغیب دیتے ہو، ۲۳

وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ﴿۱۹﴾

۱۹ اور میراث کا مال سمیٹ کر ہڑپ کر جاتے ہو، ۲۴

وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿۲۰﴾

۲۰ اور مال کی محبت میں مست رہتے ہو۔ ۲۵

كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ﴿۲۱﴾

۲۱ نہیں ۲۶! جب زمین کوٹ کوٹ کر ہموار کر دی جائے گی، ۲۷

وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿۲۲﴾

۲۲ اور تمہارا رب آئے گا صف در صف فرشتوں کے جلو میں۔ ۲۸

وَجِايْٓءَ يَوْمَىِٕذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ يَوْمَىِٕذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ﴿۲۳﴾

۲۳ اور جہنم اس روز حاضر کر دی جائے گی ۲۹، اس روز انسان ہوش میں آئے گا، مگر اس وقت اس کے ہوش میں آنے کا کیا فائدہ؟ ۳۰

يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ ﴿۲۴﴾

۲۴ وہ کہے گا کہ کاش میں نے اپنی زندگی کے لئے پہلے سے کچھ کر رکھا ہوتا! ۳۱

فَيَوْمَىِٕذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗٓ اَحَدٌ ﴿۲۵﴾

۲۵ اس دن اس کے عذاب جیسا کوئی عذاب دینے والا نہ ہوگا، ۳۲

وَّلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗٓ اَحَدٌ ﴿۲۶﴾

۲۶ اور نہ اس کے باندھنے جیسا کوئی باندھنے والا ہوگا۔

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ﴿۲۷﴾

۲۷ اے نفس مطمئنہ! ۳۳

ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿۲۸﴾

۲۸ چل اپنے رب کی طرف، تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔ ۳۴

فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ﴿۲۹﴾

۲۹ شامل ہو جا میرے بندوں میں، ۳۵

وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ﴿۳۰﴾

۳۰ اور داخل ہو جا میری جنت میں۔ ۳۶

۲۰؎ دنیا پرستانہ نقطۂ نظر کو اختیار کرنے والوں کے نزدیک، تنگ حال ہونا باعثِ ذلت ہے۔ گویا جن کو مال و دولت کی فراوانی نصیب نہیں ہوئی، وہ اللہ کی نظر میں حقیر ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ اس حالت سے انسان کو اس لئے گذارتا ہے کہ اس کی آزمائش ہو کہ وہ اپنے کو صابر و ثابت کر دکھاتا ہے یا نہیں؟ اور اپنے رب کے فیصلہ پر مطمئن ہوتا ہے یا اس کے خلاف شکوہ شکایت کرنے لگتا ہے؟ تنگ حالی انسان کے اندر حالات کا مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا کرتی ہے اور اس کے کردار کو مضبوط بناتی ہے۔ اور انسان اس مرحلہ سے گذر کر عزت و سرفرازی کا مقام حاصل کر سکتا ہے، بشرطیکہ وہ صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ دے۔ خدا کی یہ عظیم حکمت ہے جو تنگ حالی کے پیچھے کارفرما ہوتی ہے۔ لیکن سطح بیں نگاہیں اس کو نہیں پاتیں اور مغالطہ کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اس آیت نے صراحت کے ساتھ اس مغالطہ کو دور کرنے کا سامان کیا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر انسان اس مغالطہ میں رہتا ہے تو اس کے لئے اس امتحان میں ناکامی مقدر ہے۔

۲۱؎ یعنی عزت و ذلت کا یہ معیار صحیح نہیں جو دنیا پرستوں نے قائم کر رکھا ہے۔

۲۲؎ یہاں دنیا پرستوں، بالخصوص مالداروں کو براہ راست خطاب کر کے کہا جا رہا ہے کہ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اس آزمائشی زندگی میں دولت پا کر تم بندگان خدا کے حقوق ادا کرتے، بے سہارا بچوں اور محتاجوں کی مدد کرتے۔ لیکن تمہارے اندر دولت کا ایسا گھمنڈ پیدا ہو جاتا ہے کہ بجائے اس کے کہ یتیموں کی مدد کرتے، ان کی ناقدری کرنے لگتے ہو اور ان کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہو۔

اس سے واضح ہوا کہ قرآن یتیموں کی نہ صرف مدد کرنے کا حکم دیتا ہے بلکہ ان کی قدر کرنے کا بھی۔ بالفاظ دیگر قرآن غریب اور کمزور طبقہ کو سماج میں عزت کا مقام دلوانا چاہتا ہے۔ اور ایک صحیح مسلم سوسائٹی وہ ہے جس میں ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے۔

۲۳؎ غریبوں کو کھانا کھلانا اور اِس کی ایک دوسرے کو ترغیب دینا بنیادی اخلاقیات میں سے ہے، جس کی ذمہ داری انسان پر فطرۃً عائد ہوتی ہے۔ شریعت نے اس کو مزید مؤکد کر دیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں تفصیلی احکام بھی دیئے ہیں۔

یہاں قرآن نے جاہلیت کے اُس سماج پر سخت گرفت کی ہے، جس میں لوگ نہ مسکینوں کو کھانا کھلانے کی فکر کرتے اور نہ دوسروں کے اندر جذبۂ خیر پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ اس سے واضح ہے کہ قرآن انسانی سوسائٹی کو، جس وصف کا حامل دیکھنا چاہتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس کے افراد خود بھی غریبوں کی مدد کریں اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیں۔ اس طرز عمل سے بخیلی اور زر پرستی کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اور ہمدردی اور فیاضی کے جذبات پرورش پانے لگتے ہیں۔

فقر و فاقہ کے خاتمہ کے لئے یہ وصف بمنزلہ بنیاد کے ہے۔

۲۴؎ زمانۂ جاہلیت میں عورتوں اور بچوں کو وراثت سے محروم رکھا جاتا تھا۔ اور زور آور مرد میراث پر قابض ہو جاتے تھے، جس کے نتیجہ میں یتیم بچے اور بچیاں تک اپنے باپ کے ترکہ میں حصہ پانے سے محروم رہ جاتیں۔ اس آیت میں اہلِ جاہلیت کے اسی رویہ کو باطل اور مذموم قرار دیا گیا ہے۔ (مزید تشریح کے لئے ملاحظہ ہو سورۂ نساء نوٹ ۱۹؎)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وراثت کی تقسیم کا قرآنی ضابطہ تو مدینہ میں اواخر ۳ھ میں نازل ہوا جو سورۂ نساء میں شامل ہے، جب کہ سورۂ فجر مکی ہے جس میں میراث کا مال سمیٹ کر کھانے کی مذمت کی گئی ہے، تو پھر یہ گرفت میراث کے کس حکم کی خلاف ورزی کرنے پر کی گئی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وراثت کا قرآنی ضابطہ گو بعد میں نازل ہوا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب تک یہ ضابطہ نازل نہیں ہوا تھا، اس وقت تک یہ لوگ سرے سے جانتے ہی نہیں تھے کہ وراثت کا حقدار کون ہے۔ کم از کم یہ بات تو بدیہی ہے کہ باپ کی میراث کی حقدار اس کی اولاد ہے اور خاص طور سے جب وہ یتیم ہو

تو اس کے حق کی حرمت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اتنی موٹی بات سمجھنے کے لئے عقلِ عام کافی ہے۔ اور عقل و انصاف کے اس صریح تقاضے کو رد کر کے زور آور رشتہ داروں کا میراث پر قابض ہو جانا قابلِ مواخذہ کیوں نہ ہوگا؟ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ مکہ کے عرب شریعت الٰہی سے بالکل نا آشنا نہیں تھے، بلکہ وہ ابراہیمی شریعت کے وارث تھے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے کچھ اجزاء ہی ان کے پاس باقی رہ گئے تھے۔ مثلاً حج کے مناسک وغیرہ۔ اس لئے یہ خیال کرنا صحیح نہ ہوگا کہ وہ میراث کے سلسلہ میں اتنی بات بھی نہیں جانتے تھے کہ اولاد باپ کی میراث کی حقدار ہے۔ مگر یتیم بچوں اور بچیوں کو ان کے باپ کی میراث سے محروم رکھ کر، ان کا چچا پوری میراث پر قابض ہو جاتا تھا۔ آخر اس صریح حق تلفی کے لئے کیا وجہ جواز تھی؟ اور جہاں تک تورات کا تعلق ہے اس میں میراث کا ضابطہ موجود تھا۔ بائبل میں ہے ''اور بنی اسرائیل سے کہہ کہ اگر کوئی شخص مر جائے اور اس کا کوئی بیٹا نہ ہو تو اس کی میراث اس کی بیٹی کو دینا۔ اگر اس کی کوئی بیٹی بھی نہ ہو تو اس کے بھائیوں کو اس کی میراث دینا۔'' (گنتی ۲۷: ۸، ۹)

۲۵۔ یہ چوٹ ہے ان کی زر پرستی پر جس نے ان کے اندر اخلاقی گراوٹ پیدا کی تھی۔

مال و دولت کو جہاں اللہ تعالیٰ نے معاشی ضرورتوں کو پورا کرنے کا ذریعہ بنایا ہے، وہیں اس میں انسان کا بہت بڑا امتحان بھی رکھا ہے۔ یہ امتحان ایک تو اس پہلو سے ہے کہ انسان آخرت کو مقصود بناتا ہے یا دنیوی مال و دولت کو؟ دوسرے اس پہلو سے کہ مال جائز طریقہ سے حاصل کر کے جائز راہوں میں صرف کرتا ہے یا ناجائز طریقہ سے حاصل کر کے ناجائز راہوں میں صرف کرتا ہے؟ تیسرے اس پہلو سے کہ وہ اللہ کی خاطر مالی قربانیاں دیتا اور بندگان خدا کے حقوق ادا کرتا ہے یا بخل سے کام لیتا ہے اور بندگان خدا کے حقوق غصب کرتا ہے؟

۲۶۔ یعنی تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ تمہارے اس طرزِ عمل پر گرفت نہیں ہوگی۔

۲۷۔ قیامت کے دن جو زلزلہ آئے گا اور جو دھماکے ہونگے، وہ پوری زمین کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیں گے۔ عمارتیں اور محلات تو کیا پہاڑ تک ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ اور زمین ایک صاف چٹیل میدان کی شکل اختیار کرے گی، جس میں تمام انسانوں کو خدا کے حضور جوابدہی کے لئے حاضر ہونا ہوگا۔

۲۸۔ یعنی اللہ تعالیٰ قیامت کے دن خود عدالت برپا کرے گا اور وہ بنفس نفیس باز پرس بھی کرے گا۔ اور فیصلہ بھی فرمائے گا۔ اور اس کے حکم کی تعمیل اور اس کے فیصلہ کے نفاذ کے لئے فرشتے موجود ہوں گے۔

اس سے عدالتِ خداوندی کی پر ہیبت تصویر سامنے آتی ہے اور یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ آج تو اللہ تعالیٰ پسِ پردہ انسان کا امتحان لے رہا ہے، لیکن قیامت کے دن یہ پردہ اٹھا دیا جائے گا اور حقیقت بالکل بے نقاب ہو کر اس کے سامنے آجائے گی۔

۲۹۔ یعنی جب عدالت خداوندی برپا ہوگی تو جہنم بالکل سامنے موجود ہوگی۔

۳۰۔ یعنی عدالت خداوندی میں اپنے کو محصور اور جہنم کو سامنے موجود پا کر انسان کو ہوش آئے گا، کہ آخرت سے بے پروا ہو کر وہ کتنے زبردست گھاٹے میں پڑا ہے۔ اس وقت اسے یاد آئے گا کہ اللہ کے پیغمبروں کا اس دن سے متنبہ کرنا بالکل بجا تھا۔ اور جو راستہ وہ بتاتے تھے وہی صحیح تھا۔ ان کی نصیحت کو نہ مان کر اس نے بڑی حماقت کی۔ مگر اس روز ہوش میں آنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا اس لئے کہ امتحان کا وقت گذر چکا ہوگا۔ قیامت کا دن تو ظہورِ نتائج کا دن ہوگا۔ اس دن ہوش میں آنا اور نصیحت پکڑنا ایسا ہی ہے، جیسے کوئی طالب علم امتحان گاہ میں تو پرچہ حل کرنے کے بجائے ہنسی دل لگی میں وقت گذار دے۔ اور جب نتیجہ کا اعلان ہو اور وہ ناکام ہو جائے تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے۔ ظاہر ہے بعد از وقت اس کا احساس اس کی ناکامی کو کامیابی میں تبدیل نہیں کر سکتا، البتہ اس کو یاس اور حسرت کے حوالہ ضرور کر دیتا ہے۔

۳۱۔ یعنی اس روز انسان محسوس کرے گا کہ حقیقی زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔ اور میں دنیا کی زندگی ہی کو سب کچھ سمجھتا رہا۔ کاش کہ میں نے اپنی

اس زندگی کے لئے دنیا میں کچھ سامان کرلیا ہوتا!

۳۲۔ یعنی آخرت کی سزا کو ان سزاؤں پر قیاس نہ کرو، جو دنیا کی حکومتیں مجرمین کو دیتی ہیں۔ اللہ کا عذاب ایسا شدید ہوگا کہ اس طرح کا عذاب نہ کبھی کسی نے دیا ہوگا اور نہ کوئی دے سکتا ہے۔

اس سے آگاہ کرنے کے بعد بھی جو لوگ اللہ کے عذاب کی پرواہ نہ کریں اور مجرم اور سرکش بنے رہیں، ان کو اس کے عذاب کا اندازہ اسی وقت ہوگا جب کہ وہ اس کا مزہ چکھیں گے۔

عذاب کی یہ شدت جرم کی شدت کی وجہ سے ہوگی۔ جو لوگ اپنے خالق و مالک اور فرمانروائے کائنات کے خلاف سرکشانہ رویہ اختیار کرتے ہیں، وہ زبردست ڈھٹائی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اس لئے وہ شدید ترین عذاب کے مستحق ہیں۔

۳۳۔ نفس مطمئنہ سے مراد وہ انسان ہے جس نے اطمینانِ قلب کے ساتھ توحید کا اقرار کیا تھا، جس کو آخرت پر یقین تھا اور فراخی اور تنگی ہر طرح کے حالات میں وہ اپنے رب سے راضی و مطمئن رہا کہ اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔

جس شخص نے دنیا میں اطمینان قلب کی یہ صفت پیدا کرلی، وہ خدا کے ہاں اس کا مستحق ہوگا کہ اسے ہمیشہ کے لئے چین اور راحت و سکون نصیب ہو۔

۳۴۔ یہ بڑے پیارے اور رحمت بھرے الفاظ ہیں، جن میں نفسِ مطمئنہ کو فیصلہ کے دن کامیابی کا مژدۂ جاں فزا سنایا جائے گا۔ اور کامیابی بھی ایسی کہ آدمی خدا کو پالے، جس کے بعد پانے کے لئے کیا چیز باقی رہ جاتی ہے؟ بندہ اپنے خدا سے خوش اور خدا اپنے بندے سے خوش۔ عزت و سرفرازی کے اس مقام کو پہنچنے کے بعد کون سی بلندی باقی رہ جاتی ہے جہاں پہنچنے کا انسان تصور کرسکتا ہے؟

۳۵۔ ''میرے بندے'' سے مراد خدا کے نیک بندے ہیں۔ جنت کی سوسائٹی ان نیک بندوں ہی پر مشتمل ہوگی۔

نیک لوگوں کے زمرہ میں شمولیت اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہوگی، لیکن یہ نعمت ان ہی لوگوں کو میسر آئے گی جو واقعی اس کے قدرداں ہیں۔ اور جو نیک لوگوں سے ملنا پسند کرتے ہیں، اور ان کے ساتھ رہنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ بخلاف اس کے جو لوگ دنیا میں نیک لوگوں سے نفرت کرتے اور ان سے دور بھاگتے رہے اور ان کی ساری دلچسپی خدا بیزار لوگوں سے رہی ان کا حشر بھی خدا بیزار لوگوں ہی کے ساتھ ہوگا۔

۳۶۔ جنت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے (میری جنت)۔ یہ نسبت جنت کے شرف کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے اور اس بات کی طرف بھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا مظہر ہوگی۔

سورۂ البلد

۹۰۔ البلد

نام پہلی آیت میں البلد (شہر) کا لفظ آیا ہے جس سے مراد شہر مکہ ہے۔ اس مناسبت سے اس سورہ کا نام ''البلد'' قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول مکی ہے اور مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مکہ کے ابتدائی دور کی تنزیل ہے۔

مرکزی مضمون یہ سورہ سابق سورہ کا تکملہ ہے، جس میں واضح کیا گیا ہے کہ انسان ایک اخلاقی وجود رکھنے والی مخلوق ہے، جسے دارالامتحان میں کھڑا کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا اس کا یہ سمجھنا کہ میں من مانی کرنے کے لئے آزاد ہوں، اور مجھے خدا کے حضور جوابدہی کے لئے حاضر ہونا نہیں ہے، وہ بنیادی غلطی ہے جو انسان کے پورے رویہ کو غلط بنا کر رکھ دیتی ہے۔ اس کے بعد نہ اس میں فرض شناسی پیدا ہوتی ہے اور نہ حقوق کی ادائیگی کا احساس اُبھرتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ انسان جہنم کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔

نظمِ کلام آیت ۱ تا ۴ میں جو شہادتیں پیش کی گئی ہیں، ان سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ دنیا عشرت کدہ نہیں ہے۔ اور نہ انسان کو یہاں عیش وعشرت کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ بلکہ اس کی تخلیق ایک خاص مقصد کے تحت ہوئی ہے۔ اس لئے اسے پیدا ہی مشقت کی حالت میں کیا گیا ہے۔

آیت ۵ تا ۷ میں انسان کے غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل پر گرفت کرتے ہوئے، اس کے ضمیر کو جھنجھوڑا گیا ہے کہ کیا وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ اس کے اوپر کوئی بالاتر طاقت نہیں ہے، جو اس کے طرزِ عمل کی نگرانی کرنے والی ہو؟

آیت ۸ تا ۱۷ میں واضح کیا گیا ہے کہ انسان کے لئے، اخلاق وعمل کی بلندی کی راہ بھی کھول دی گئی ہے اور پستی کی راہ بھی۔ بلندی کی راہ کٹھن ضرور ہے، مگر اس چڑھائی پر چڑھ کر آدمی اخلاقی ارتقاء کی منزلیں طے کر لیتا ہے اور بلند مقام پر پہنچ جاتا ہے۔

آیت ۱۸ تا ۲۰ میں بتایا گیا ہے کہ ایمان کے ساتھ، اخلاقی بلندی کی راہ اختیار کرنے کا انجام یہ ہے کہ آدمی خوش بختی اور سعادت کی منزل کو پہنچ جاتا ہے۔ بخلاف اس کے کفر کی راہ اختیار کرنے والے جہنم کے گڑھے میں جا گرتے ہیں، جس سے نکلنے کی پھر کوئی صورت نہ ہوگی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ﴿۱﴾

وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ﴿۲﴾

وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ۙ﴿۳﴾

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ؕ﴿۴﴾

اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ ۘ﴿۵﴾

يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ؕ﴿۶﴾

اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗٓ اَحَدٌ ۘ﴿۷﴾

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۙ﴿۸﴾

وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ۙ﴿۹﴾

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۚ﴿۱۰﴾

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۖ﴿۱۱﴾

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ؕ﴿۱۲﴾

فَكُّ رَقَبَةٍ ۙ﴿۱۳﴾

اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۙ﴿۱۴﴾

يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۙ﴿۱۵﴾

اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ؕ﴿۱۶﴾

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ؕ﴿۱۷﴾

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ؕ﴿۱۸﴾

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ؕ﴿۱۹﴾

عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ۧ﴿۲۰﴾

۹۰۔ سُوْرَةُ الْبَلَدِ

آیات:۲۰

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ نہیں! ۱؎ میں قسم کھاتا ہوں ۲؎ اس شہر کی، ۳؎

۲ ۔۔۔۔اور تم اس کے رہنے والے ہو ۴؎۔۔۔۔

۳ اور جننے والے کی ۵؎، اور اس کی جسے اس نے جنا، ۶؎

۴ فی الواقع ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا ہے۔ ۷؎

۵ کیا وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کسی کا بس نہیں چلے گا؟ ۸؎

۶ کہتا ہے کہ میں نے ڈھیروں مال اڑا دیا۔ ۹؎

۷ کیا وہ سمجھتا ہے کہ اس کو کسی نے دیکھا نہیں ! ۱۰؎

۸ کیا ہم نے اس کو نہیں دیں دو آنکھیں؟ ۱۱؎

۹ اور زبان اور دو ہونٹ ؟ ۱۲؎

۱۰ اور اسے دونوں راستے نہیں دکھائے؟ ۱۳؎

۱۱ مگر اس نے گھاٹی عبور نہیں کی۔ ۱۴؎

۱۲ اور تم نے کیا سمجھا کہ وہ گھاٹی کیا ہے ؟ ۱۵؎

۱۳ گردن چھڑانا، ۱۶؎

۱۴ یا فاقہ کے دن کھانا کھلانا۔ ۱۷؎

۱۵ قرابت دار یتیم کو، ۱۸؎

۱۶ یا خاک نشین مسکین کو۔ ۱۹؎

۱۷ پھر وہ شامل ہوتا ان لوگوں میں جو ایمان لائے ۲۰؎۔ اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور ہمدردی کی تلقین کی۔ ۲۱؎

۱۸ یہی لوگ ہیں سعادت مند۔ ۲۲؎

۱۹ اور جنہوں نے ہماری آیت کا انکار کیا وہ بدبخت لوگ ہیں۔

۲۰ ان پر آگ چھائی ہوئی ہوگی جس کو بند کر دیا جائے گا۔ ۲۳؎

۱؎ یعنی تمہارا یہ خیال صحیح نہیں کہ دنیا کی زندگی مزے اڑانے کے لئے ہے۔ یہاں نہ کوئی آزمائش ہو رہی ہے اور نہ کبھی جزا و سزا سے سابقہ پیش آئے گا۔

۲؎ قسم کی تشریح کے لئے ملاحظہ ہو سورۂ تکویر نوٹ ۱۴؎۔

۳؎ اس شہر سے مراد مکہ ہے جہاں یہ سورہ نازل ہوئی۔

۴؎ خطاب اہل مکہ سے ہے جو اس سورہ کے اولین مخاطب تھے۔ ضمیر مخاطب واحد (اَنْتَ) استعمال ہوئی ہے۔ کیوں کہ یہاں مخاطب مکہ کا ہر فرد ہے۔ گویا مکہ کے رہنے والوں کو فرداً فرداً دعوت فکر دی گئی ہے۔

۵؎ مراد ماں ہے جو بچہ کو تکلیف سے جنتی ہے۔

والد کا لفظ مذکر استعمال ہوا ہے۔ لیکن یہ لفظ جس طرح باپ کے لئے بولا جاتا، اسی طرح ماں کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ (ملاحظہ ہو لسان العرب لفظ وَلَدٌ) اس کی نظیر لفظ حامل ہے، جو حاملہ کے لئے بولا جاتا ہے۔ ان مذکر الفاظ کا استعمال مؤنث کے لئے اس وقت کیا جاتا ہے جب بات مبہم انداز سے کہنا ہو۔ اور مرد یا عورت کی صراحت بلاغت کی رو سے نامناسب ہو۔

موقعِ کلام کے لحاظ سے یہاں ماں مراد لینا ہی صحیح ہے، کیوں کہ بعد والی آیت میں انسان کے مشقت میں پیدا کئے جانے کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے جننے کی مشقت ماں کو ہوتی ہے نہ کہ باپ کو۔

۶؎ مراد ہر وہ بچہ ہے جو ماں کے پیٹ سے جنم لیتا ہے۔ اور بچہ کا جنم لینا تکلیف کے ساتھ ہوتا ہے۔

۷؎ یہ وہ دعویٰ ہے جس پر مذکورہ قسمیں بطور شہادت کے کھائی گئی ہیں۔ انسان کا مشقت کی حالت میں پیدا ہونا ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ اس حقیقت کی تائید میں چند باتوں کو پیش کر کے اسے مزید مؤکد کر دیا گیا ہے۔ مکہ کی سرزمین پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک بے آب و گیاہ وادی ہے۔ ریگستان ہونے کی وجہ سے یہاں کا موسم بڑا سخت ہوتا ہے۔ نزول قرآن کے زمانہ میں یہاں کی زندگی عام طور سے جفاکشی کی زندگی تھی۔ مکہ کے اس قدرتی ماحول کی طرف قرآن نے اس کے باشندگان کی توجہ مبذول کرائی کہ تم نے اس بات پر بھی غور کیا کہ یہ ماحول پر مشقت کیوں بنایا گیا ہے؟ اگر یہ دنیا عشرت کدہ ہوتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ جو شہر اُم القریٰ قرار پایا وہ مشقتوں سے گھرا ہوا ہوتا۔ تم نہ صرف یہ کہ اس کے ماحول کا مشاہدہ کرتے ہو، بلکہ اس کی تاریخ سے بھی خوب واقف ہو کہ کن دشواریوں سے گذر کر، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ نے بیت اللہ کی تعمیر کا تاریخی کارنامہ انجام دیا تھا۔ الغرض اس شہر کے جغرافیائی اور تاریخی حالات دونوں اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ یہ دنیا تفریح گاہ نہیں ہے، بلکہ محنت و مشقت کی جگہ ہے، اور اس میں انسان کا امتحان ہے۔ اس طرح انسان کی اپنی پیدائش بھی اس حقیقت کا ناقابل انکار ثبوت ہے۔ بچہ جب ماں کے پیٹ سے جنم لیتا ہے تو یہ مرحلہ ماں کے لئے کتنا مشکل اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اور جب وہ اس دنیا میں آتا ہے، تو مشقتوں سے گھرا ہوا، اور روتے ہوئے ہی آتا ہے، جو اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ انسان دنیا میں مزے اڑانے کیلئے نہیں آیا ہے، بلکہ تکلیف اور مشقت کو ساتھ لے کر آزمائش کی بھٹی سے گذرنے کے لئے آیا ہے۔ پس انسان کے مشقت کی حالت میں پیدا ہونے کی حقیقت ایک دوسری بہت بڑی حقیقت کا پتہ دیتی ہے۔ اور وہ ہے جزا و سزا کا معاملہ، جس سے انسان کو لازماً سابقہ پیش آنا ہے۔ کیوں کہ یہ زندگی جب ابتلاء و آزمائش کی زندگی ٹھہری، تو اس کا لازمی تقاضا ہے کہ یوم حساب برپا ہو اور امتحان میں کامیابی و ناکامی کے نتائج سامنے آئیں۔

یہ ہے وہ استدلال جو ان آیات میں مضمر ہے۔ ساتھ ہی ایک اہم پہلو کی طرف بھی اشارہ نکلتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مشقتوں اور تکلیفوں میں انسان کی

عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔ شہر مکہ کو جس شخص نے بسایا اسے کیسی کیسی مشقتوں اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا اور اسکی زندگی کس قدر صبر آزما رہی۔ لیکن ان حالات سے گزر کر ہی اس کے ہاتھوں خانۂ کعبہ کی تعمیر کا عظیم اور تاریخی کارنامہ انجام پا سکا۔ اور اس کے بعد ہی وہ امامت کے منصب پر فائز ہوا۔ معلوم ہوا کہ اس دنیا میں جو تکلیفیں اور مشقتیں انسان کے ساتھ لگی ہوئی ہیں، وہ درحقیقت انسان کو تکلیف میں ڈالنے کے لئے نہیں، بلکہ اس کو اوپر اٹھانے کے لئے ہیں۔ انسان اگر اپنا حوصلہ پست نہ رکھے اور خدائی رہنمائی کو قبول کر کے پیش آمدہ تکلیفوں میں فرض شناسی کا ثبوت دے، تو اس کے اندر انسانیت کا جو جوہر ہے وہ کھلنے لگتا ہے اور وہ بلندیوں کو چھو لیتا ہے۔ ؎

رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد آدمی بنتا ہے انساں ٹھوکریں کھانے کے بعد

اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کی تعمیر کے لئے کسی ایسے خطہ کا انتخاب نہیں فرمایا جہاں باغ و بہار ہو، بلکہ پہاڑوں سے گھری ہوئی ریگستانی زمین کا انتخاب فرمایا۔ اس انتخاب کے پیچھے یہ عظیم حکمت کارفرما ہے کہ اس کے گھر کی زیارت کرنے والوں کے لئے، باطنی کشش کا سامان ہو نہ کہ ظاہری کشش کا۔ اور اس سے انسان کو یہ رہنمائی ملے کہ خدا تک پہنچنے کی راہ آسائشوں سے ہو کر نہیں، بلکہ دشواری اور کٹھنائیوں سے ہو کر گذرتی ہے۔

اس واضح حقیقت کے بعد اور ان روشن دلائل کی موجودگی میں انسان تکلیف پہنچنے پر کیوں بلبلا اٹھتا ہے؟ اور پست ہمتی کا کیوں شکار ہو جاتا ہے؟ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ انسان اپنی حیثیت اور اس دنیا کے بارے میں صحیح نقطۂ نظر اختیار نہیں کرتا۔ وہ دنیا کو آرام گاہ خیال کرتا ہے اور اس سے آسائش ہی کی امیدیں رکھتا ہے۔ لیکن جب اس کے ان جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے اور تکلیف اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ بلبلا اٹھتا ہے۔ اور پھر فرض شناسی کا ثبوت دینے اور حوصلے کے کام کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ اس طرح انسان کی پوری زندگی غلط ہو کر رہ جاتی ہے اور امتحان میں ناکام ہو جانے کی بنا پر وہ سزا کا مستحق ہو جاتا ہے۔

۸؎ یعنی انسان جو مشقتوں میں گھرا ہوا پیدا ہوتا ہے، اور اس کے بعد اسے زندگی کی پُرخطر راہوں سے گذرنا پڑتا ہے کہ معلوم نہیں، کس وقت اُسے کس حادثہ سے دوچار ہونا پڑے اور کس مصیبت کا اس پر نزول ہو؟ وہ اس غرور نفس میں کس طرح مبتلا ہو جاتا ہے کہ کوئی بالاتر طاقت اس کو پکڑنے والی نہیں ہے۔ اور وہ جو چاہے کرے اس پر کسی کا بس نہیں چلے گا؟ انسان کا مشقت سے گھرا ہونا تو اس کی اپنی بے بسی کو ظاہر کرتا ہے۔ اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس پر ایک بالاتر ہستی کا اقتدار قائم ہے جس کے فیصلے اس پر نافذ ہو کر رہتے ہیں۔

۹؎ یہ ایک مثال ہے اس بات کی کہ دنیا کو تفریح گاہ خیال کرنے کے نتیجہ میں انسان کا رویہ کتنا غیر ذمہ دارانہ ہو کر رہ جاتا ہے؟ یہ مثال ان مالداروں کی ہے جو دولت کو بے جا خرچ کرتے ہیں اور پھر اپنے ان نمائشی اخراجات پر فخر کرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے مال اس لئے عطا کیا تھا کہ وہ اس کو جائز اور خیر کی راہوں میں خرچ کرتے، اپنی جائز ضرورتیں بھی پوری کرتے اور بندگان خدا کے حقوق بھی ادا کرتے۔ مگر انہوں نے اسے نمائشی اور مسرفانہ اخراجات کا ذریعہ بنا لیا اس طرح امتحان کے اس اہم پرچے کو حل کرنے میں وہ بُری طرح ناکام رہے۔

مال کو اڑانا، خواہ وہ مشرکانہ مراسم ادا کرنے کے لئے ہو، خواہ جاہلی رسومات کو پورا کرنے کے لئے، دعوتوں اور تقریبات کی شان بڑھانے کے لئے ہو یا آرٹ اور فن کے نام پر نمائشی یادگاریں تعمیر کرنے کے لئے ہو، نام و نمود حاصل کرنے کے لئے ہو یا شان و شوکت کے اظہار کے لئے، نہ صرف کھلے گناہ کا کام ہے بلکہ اس سے غریبوں اور محتاجوں کی حق تلفی بھی ہوتی ہے۔

۱۰؎ یعنی کیا فضول خرچی کر کے اس پر فخر کرنے والا یہ سمجھتا ہے کہ کوئی طاقت اس کی نگرانی نہیں کر رہی ہے؟ اور اس کو دولت اس لئے ملی ہے کہ وہ گل چھرے اڑائے یا اپنے لئے عیش پرستی کا سامان کرے؟ اگر ایسا ہے تو یہ سب سے بڑی حماقت ہے۔ خدا تو انسان کی ہر حرکت کو دیکھ رہا ہے اور جب دیکھ

رہا ہے تو باز پرس بھی کرے گا۔

۱۱۔ یعنی خدا نے اسے دیکھنے کی صلاحیت بخشی تھی تا کہ وہ کائنات کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ ابھری ہوئی حقیقت کا مشاہدہ کرے۔ مگر اس نے اسی کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ سب کچھ دیکھتا رہا مگر اسے ایک قدیر ہستی کا ہاتھ کہیں نظر نہیں آیا۔

۱۲۔ اللہ تعالیٰ نے زبان اور دو ہونٹ دے کر انسان کو گویائی کی صلاحیت بخشی ہے۔ اور یہ صلاحیت اس لئے بخشی ہے تا کہ وہ اپنے رب کے گن گائے اور حق وانصاف کی باتیں کرے، مگر انسان کا حال عجیب ہے۔ اس نعمت کو پالینے کے باوجود اس میں شکر کا جذبہ نہیں اُبھرتا۔ وہ باتیں خوب بناتا ہے مگر اس کی زبان نہیں کھلتی تو اپنے رب کے گن گانے کیلئے، اور وہ لفاظی سے خوب کام لیتا ہے مگر حق وانصاف کیلئے اس کی زبان گنگ ہو جاتی ہے۔

۱۳۔ یعنی بھلائی اور برائی، نیکی اور بدی اور خیر اور شر کے دونوں راستے اسے دکھا دئے۔ یہ فطرت کی رہنمائی ہے، جو انسان کو عطا کی گئی ہے۔ چنانچہ بھلائی اور برائی میں انسان فطرۃً تمیز کرتا ہے۔ (مزید تشریح سورۂ الشّمس میں آرہی ہے۔ انشاءاللہ)

خیر وشر کی دونوں راہیں اس لئے دکھائیں، تا کہ انسان اپنی ذمہ داری پر جس راستہ کو چاہے اختیار کرلے۔

۱۴۔ متن میں لفظ ''عقبۃ'' استعمال ہوا ہے جس کے معنیٰ گھاٹی کے ہیں۔ یعنی وہ دشوار گذار راستہ جو پہاڑوں کے درمیان سے گذرتا ہے، اور جس کو طے کرنے کیلئے آدمی کو چڑھائی چڑھنا پڑتی ہے۔ یہاں اس سے مراد نیکی کا راستہ، جو دشوار گذار اور مشقت طلب ہے۔ لیکن یہ چڑھائی چڑھ کر آدمی بلندی پر پہنچ جاتا ہے۔

نیکی کے کاموں میں چونکہ لذت محسوس نہیں ہوتی، اور خواہشات کے علی الرغم یہ کام انجام دینا پڑتا ہے، اس لئے وہ نفس پر شاق گذرتے ہیں۔ بخلاف اس کے بدی اور گناہ کے کام لذت بخش ہوتے ہیں اور خواہشات بھی ان پر اُبھارتی ہیں، اس لئے نفس اس کی طرف آسانی سے چل پڑتا ہے۔ اس حقیقت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

حُجِبَتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ وَ حُجِبَتِ الْجَنَّةُ بِالْمكَارِهِ۔

'' جہنم خواہشات نفس سے ڈھانپ دی گئی ہے اور جنت ایسی باتوں سے جو نفس کو ناگوار ہیں۔'' (بخاری کتاب الرقاق)

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی اس کو تمثیلی انداز میں بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ انجیل متی میں ہے: '' تنگ دروازہ سے داخل ہو۔ کیونکہ وہ دروازہ چوڑا ہے اور وہ راستہ کشادہ ہے، جو ہلاکت کو پہنچتا ہے، اور اس سے داخل ہونے والے بہت ہیں۔ لیکن وہ دروازہ تنگ ہے اور وہ راستہ سکڑا ہے، جو زندگی کو پہنچتا ہے اور اس کے پانے والے تھوڑے ہیں۔'' (متی ۷: ۱۳، ۱۴)

۱۵۔ یہ سوال گھاٹی کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اچھی طرح سمجھ لو۔ نیکی کی راہ کٹھن راہ ہے، جس سے گذرے بغیر آدمی کامیابی کی منزل کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس راہ میں مال کی قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔ لیکن جن لوگوں نے مال کو عیش پرستی کا ذریعہ بنایا ہو وہ اس راہ میں کیا قدم رکھ سکیں گے۔

۱۶۔ یعنی غلام کو آزاد کرنا یا اس کو آزاد کرانے میں مالی تعاون کرنا۔ اس سورہ میں جو ایک مکی سورہ ہے اور ابتدائی دور کی نازل شدہ ہے، غلاموں کو آزاد کرنے کی اس حد تک تاکید، کہ نیکی کے دشوار گذار راستہ کی پہلی سیڑھی ہی یہ عمل قرار پائے، نہ صرف اس کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے، بلکہ اس سے غلامی کے مسئلہ میں قرآن کا اصل نقطۂ نظر بھی نمایاں ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ جب غلام کو آزاد کرنا سب سے بڑی نیکی قرار پائی تو کسی آزاد کو غلام بنانے کے لئے اسلام میں کیا گنجائش ہوسکتی ہے؟ اسی لئے حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس شخص سے سخت باز پرس کرے گا، جس نے

کسی آزاد کو فروخت کر کے اس کی قیمت کھائی۔ (رَجُلٌ بَاعَ حُرًّا ثُمَّ اَکَلَ ثَمَنَہٗ۔ بخاری)

(مزید تشریح کے لئے ملاحظہ ہو سورۂ نساء نوٹ ۶۴ ؎)

۱۷؎ محتاجوں کو کھانا کھلانا ہر حال میں نیکی کا کام ہے۔ لیکن بھوک کی حالت میں اور قحط کے زمانہ میں اس کی ضرورت اور اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

۱۸؎ ہر یتیم مدد کا مستحق ہے لیکن اگر وہ قرابت دار ہو تو اور زیادہ مدد کا مستحق ہو جاتا ہے۔

۱۹؎ مسکین بھی ہر حال میں مدد کا مستحق ہے۔ لیکن جب اسے غربت نے خاک آلود کر دیا ہو یا افلاس اور بدحالی نے اسے زمین پر پڑے رہنے (اور موجودہ زمانہ میں یوں کہئے کہ فٹ پاتھ پر گذر بسر کرنے) کے لئے مجبور کر دیا ہو تو وہ اور زیادہ مدد کا مستحق ہو جاتا ہے۔ ان آیتوں میں نیکی کے کاموں کی چند مثالیں بیان کی گئیں ہیں۔ مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ مال کا صحیح اور بہترین مصرف یہ ہے۔ اور اس قسم کے کام کر کے ہی آدمی اخلاق و کردار کی بلندی کی طرف جا سکتا ہے۔ رہے وہ لوگ جو شہرت کی خاطر فضول خرچی کرتے ہیں تو ان کے حصہ میں سوائے محرومی کے کچھ نہیں آتا۔

۲۰؎ یعنی ان نیک کاموں کو انجام دینے کے ساتھ، یہ ضروری ہے کہ آدمی ایمان لا کر زمرۂ مؤمنین میں شامل ہو۔ کیوں کہ ایمان کے بغیر کوئی نیکی بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہیں ہوگی۔ قرآن نے دوسرے مقامات پر بھی اس کی صراحت کی ہے۔ اور ایمان معتبر نہیں ہے، جب تک آدمی قرآن اور حضرت محمد ﷺ کی رسالت پر ایمان نہ لے آئے۔

۲۱؎ یہاں اہل ایمان کی دو اہم صفتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے ہیں، اور دوسری یہ کہ وہ ایک دوسرے کو ہمدردی کی نصیحت کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ایک مؤمن کا اپنے طور سے صبر کرنا اور دوسروں کے ساتھ ہمدردی کرنا کافی نہیں۔ بلکہ ضروری ہے کہ ان دونوں باتوں کی دوسروں کو تلقین کی جائے۔ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اہل ایمان کو باہم مربوط اور ایک دوسرے کا ہمدرد اور بہی خواہ ہونا چاہئے۔ اور یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اہل ایمان کے زمرہ میں شامل ہو جانے کے بعد ان پر معاشرتی اور اجتماعی ذمہ داریاں بھی عائد ہو گئی ہیں۔

۲۲؎ یعنی یہ کامیاب و بامراد ہونے والے لوگ ہیں۔ کیوں کہ یہ امتحان میں پورے اترے اور انہوں نے وہ صفات اپنے اندر پیدا کر لیں، جو کامیابی کی ضمانت تھیں۔ یہ سعید روحیں ہیں جو ابدی سعادت سے بہرہ مند ہوں گی۔

۲۳؎ یعنی ان کو آگ میں ڈالنے کے بعد اوپر سے دروازے بند کر دئے جائیں گے۔ اور وہ آگ میں اس طرح گھرے رہیں گے کہ اس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ پا سکیں گے۔

۹۱۔ الشمس

نام پہلی آیت میں اَلشَّمْس (سورج) کی قسم کھائی گئی ہے ۔اس مناسبت سے اس سورہ کا نام 'الشمس' ہے۔

زمانۂ نزول مکی ہے۔اور مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اس وقت نازل ہوئی، جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکذیب اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کا آغاز ہو چکا تھا۔

مرکزی مضمون انسان کو سرکشی کے انجامِ بد سے آگاہ کرنا ہے۔اور اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ نفس کی پاکیزگی اور اس کی صحیح نشوونما کامیابی کی ضمانت ہے۔بخلاف اس کے نفس کو برائیوں سے آلودہ کرنا ناکامی و نامرادی کا موجب ہے۔کیونکہ برائیاں سرکشی پر آمادہ کرتی ہیں اور سرکشی کا انجام ہلاکت ہے۔

نظم کلام آیت ۱ تا ۱۰ میں آفتاب و ماہتاب، شب و روز اور زمین و آسمان کی ان عظیم نشانیوں کی طرف متوجہ کیا گیا ہے، جو اس کائنات کے خالق کے کمالِ قدرت و حکمت پر دلالت کرتی ہیں۔مزید برآں نفسِ انسانی کی شہادت کو جزا و سزا کی تائید میں پیش کیا گیا ہے۔

آیت ۱۱ تا ۱۵ میں تاریخی شہادت پیش کی گئی ہے۔اس سلسلہ میں قومِ ثمود کا واقعہ مختصراً بیان کیا گیا ہے، تاکہ ان کی سرکشی کا جو انجام ہوا، اس سے لوگ عبرت حاصل کریں اور قرآن اور پیغمبرِ اسلام کے ساتھ معاندانہ رویہ اختیار کرنے سے باز رہیں۔

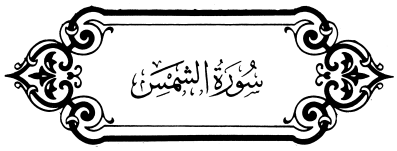

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالشَّمْسِ وَضُحٰىهَا ۝١

وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ۝٢

وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا ۝٣

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىهَا ۝٤

وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰىهَا ۝٥

وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰىهَا ۝٦

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝٧

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝٨

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝٩

وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝١٠

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ ۝١١

اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ۝١٢

فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ۝١٣

فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۣ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ۝١٤

وَلَا يَخَافُ عُقْبٰىهَا ۝١٥

۹۱۔ سُوْرَةُ الشَّمْسِ

آیات:۱۵

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ قسم ہے ا ے ، سورج اوراس کی روشنی کی۔ ۲ ے

۲ اور چاند کی جب اس کے پیچھے آئے ۔ ۳ ے

۳ اوردن کی جب اسے بے نقاب کرے ۔ ۴ ے

۴ اوررات کی جب اس کو ڈھانک لے۔ ۵ ے

۵ اورآسمان کی اوراس ہستی کی، جس نے اسے بنایا۔ ۶ ے

۶ اورزمین کی اوراس ہستی کی، جس نے اسے بچھایا۔

۷ اورنفس کی اوراس ہستی کی، جس نے اسے درست بنایا۔ ۷ ے

۸ پھراس کی بدی اور پرہیزگاری اس پر الہام کردی۔ ۸ ے

۹ یقیناً کامیاب ہوا وہ، جس نے اس کا تزکیہ کیا۔ ۹ ے

۱۰ اورنامراد ہوا وہ، جس نے اس کو آلودہ کیا۔ ۱۰ ے

۱۱ ثمود نے اپنی سرکشی کی وجہ سے جھٹلایا ۔ ۱۱ ے

۱۲ جب ان کا سب سے بڑا بدبخت اٹھ کھڑا ہوا۔ ۱۲ ے

۱۳ تو اللہ کے رسول نے ۱۳ ے، ان لوگوں سے کہا کہ خبردار اللہ کی اونٹنی اوراس کے پانی پینے کی باری (سے تعرض نہ کرنا)۔ ۱۴ ے

۱۴ مگرانہوں نے اس کو جھٹلایا اور اونٹنی کی کوچیں کاٹ دیں۔ ۱۵ ے بالآخر اللہ نے ان کے گناہ کی پاداش میں ان پر عذاب نازل کیا اوران کو (زمین کے) برابر کردیا۔ ۱۶ ے

۱۵ اوراس (اللہ) کو ان کے انجام سے کوئی اندیشہ نہیں۔ ۱۷ ے

۱۔ قسم کی تشریح کے لئے دیکھئے سورۂ تکویر نوٹ ۱۴۔

۲۔ یعنی جب سورج طلوع ہوتا ہے تو چار دانگ عالم میں روشنی پھیل جاتی ہے۔اور جوں جوں سورج چڑھنے لگتا ہے اس کی تمازت بڑھنے لگتی ہے۔ یہ کیفیت اس بات کی روشن دلیل ہے کہ سورج کی باگ ڈور اس کے خالق کے ہاتھ میں ہے۔ کیوں کہ وہ اس کے مقرر کردہ وقت ہی پر طلوع ہوتا اور اوپر چڑھتا ہے۔

۳۔ یعنی اگر سورج کی ضیاء پاشیاں دن میں ہوتی ہیں تو چاند کی جلوہ افرینیاں رات میں۔سورج دن کا بادشاہ ہے تو چاند، رات کی ملکہ، چنانچہ وہ اپنی بزم رات ہی میں سجاتا ہے۔اس حقیقت کے پیش نظر چاند کو سورج کے پیچھے آنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ تعبیر اس لحاظ سے بھی صحیح ہے کہ چاند سورج ہی سے روشنی حاصل کرتا ہے۔اس طرح چاند کا سورج کے تابع ہونا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ سورج کی طرح چاند کی باگ ڈور بھی اس کے خالق ہی کے ہاتھ میں ہے۔

۴۔ سورج کی ساری چمک دمک دن کے اوقات میں ہوتی ہے۔گو یا وہ دن ہی ہے جو سورج کو بے نقاب کرتا ہے۔اور سورج کی مجال نہیں کہ وہ وقت سے پہلے نمودار ہو۔

گو سورج کا طلوع زمین کی گردش کے نتیجہ میں ہوتا ہے۔لیکن یہاں صورتِ واقعہ کا جغرافیائی یا فلکیاتی پہلوز یر بحث لانا مقصود نہیں ہے، بلکہ مقصود اس اہم حقیقت کی طرف متوجہ کرنا ہے کہ جو کیفیات دنیا پر طاری ہوتی ہیں، وہ ایک باقاعدہ نظام کے تحت ظہور میں آتی ہیں۔قدرت کے اس نظام میں ہر چیز حتیٰ کہ سورج بھی جس سے یہ دنیا چمک اٹھتی ہے، ایسی جکڑی ہوئی ہے کہ کسی کے لئے سرِ موانحراف کی گنجائش نہیں، ورنہ عالم کا سارا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے۔

۵۔ زمین کے جس حصہ پر رات طاری ہوتی ہے وہاں سورج کی روشنی نہیں پہنچ سکتی۔اس لئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گو یا رات نے آکر سورج کو ڈھانک لیا ہے، یہ اندازِ بیان مشاہدہ کے اعتبار سے اختیار کیا جاتا ہے۔یہاں کہنے کا منشاء یہ ہے کہ دنیا کے جس حصہ پر رات طاری ہو جاتی ہے۔وہاں سورج نمودار نہیں ہوسکتا۔ بالفاظ دیگر وہ رات کے وقت اپنا چہرہ چھپانے کے لئے مجبور ہے، اور اس کی یہ مجبوری اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس قانون کی پابندی سے سرِ موتجاوز نہیں کرسکتا، جو اس کے خالق نے اس کے لئے مقرر کر رکھا ہے۔اس سے ضمناً نظریۂ الحاد کی بھی تردید ہوتی ہے اور مشرکانہ عقیدہ کی بھی۔ کیونکہ اگر سورج اتفاقی حادثہ کے طور پر وجود میں آ گیا ہوتا تو وہ ایک محکم نظام کا پابند نہیں ہوسکتا تھا۔اور اگر وہ دیوتا ہوتا تو قانونِ قدرت میں جکڑ کر نہیں رہتا، اور رات کے بس کی بات نہیں تھی کہ اس کے چہرہ کو چھپا لیتی، بلکہ وہ اپنے زور پر رات کو بھی نمودار ہوتا۔مگر اس پورے نظامِ شمسی میں جو جکڑ بندیاں پائی جاتی ہیں، وہ ''سوریہ دیوتا'' کے مشرکانہ تصور کی سراسر نفی کرتی ہیں۔

۶۔ آسمان کی قسم کھانے کا مطلب یہ ہے کہ اُس کی عظیم الشان بناوٹ اور اس کی بلندی، انسان کو اس بات کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ اس کی چوٹی بھی اس کے خالق ہی کے ہاتھ میں ہے۔

''اس ہستی کی قسم جس نے اسے بنایا'' سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ آسمان کا خالق ایک قادر مطلق ہستی ہے۔اور اس کا وجود ایک ایسی حقیقت ہے جو شبہ سے بالاتر ہے۔قسم جہاں شہادت کے مفہوم میں آتی ہے وہاں وہ کسی بات کے محقق، اور یقینی ہونے کے پہلو کو واضح کرنے کے لئے بھی آتی ہے۔ چنانچہ یہاں اور بعد کی دو آیتوں میں ''اس ہستی کی قسم'' جو کھائی گئی ہے وہ اسی مفہوم، میں ہے یعنی یہ قسم بطور تاکید کے ہے۔

۷۔ نفس کو درست بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی کو سیدھی فطرت پر پیدا کیا اور اس میں اعلیٰ صلاحیتیں ودیعت فرمائیں۔اسے

پیدائشی گنہگار نہیں بنایا اور نہ اسے جبلی طور پر مفسد اور شر پسند بنایا کہ خدا سے سرکشی کرنے اور شیطانی خصلتیں اختیار کرنے پر مجبور ہو۔ اس نے اسے صحیح الفطرت بنایا ہے اور اس کے باطن میں فساد کا کوئی عنصر نہیں رکھا کہ وہ راہِ راست کو اختیار کرنا چاہے، اور نہ کر سکے اور گمراہی کو اختیار کرنے پر مجبور ہو۔ اس حقیقت کو قرآن نے دوسری جگہ کھول کر بیان فرمایا ہے۔:

فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا۔ (سورۂ روم:۳۰)

''اللہ کی وہ فطرت جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا۔''

اور اس کی وضاحت نبی ﷺ نے حدیث میں اس طرح فرمائی ہے:

مامن مولودٍ الّا یولد علی الفطرۃ۔ فأبَواہ یھودانہ وینصّرانہ ویشّرکانِہ۔ (مسلم کتاب القدر)

''کوئی بچہ ایسا نہیں جو فطرت پر پیدا نہ ہوتا ہو۔ پھر اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی یا مشرک بنا دیتے ہیں۔''

۸۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو نیکی و بدی کا شعور عطاء کیا ہے جس کی بناء پر وہ خیر و شر میں امتیاز کرتا ہے۔ اور یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ کام اچھے ہیں اور وہ کام بُرے۔ چنانچہ انسان جھوٹ، ظلم و زیادتی اور بے حیائی کو فطرۃً برا سمجھتا ہے اور اس قسم کے اخلاق و اعمال سے نفرت کرتا ہے۔ اور سچائی، انصاف، انسانی ہمدردی اور شرم و حیا کی پاسداری کو اچھا سمجھتا ہے، اور اس قسم کے اخلاق و اعمال کو پسند کرتا ہے۔ یہ شعور درحقیقت فطرت کی رہنمائی ہے۔ اور یہ رہنمائی اللہ تعالیٰ ہی نے ہر نفس کے اندر ودیعت فرمائی ہے، جسے یہاں الہام سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہ شعور انسان کے اپنے نفس کی شہادت ہے کہ وہ اخلاقی وجود رکھنے والی ذمہ دار مخلوق ہے۔ اور جب اس کی حیثیت یہ ہے تو اس کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ اپنے اعمال کے سلسلہ میں اپنے رب کے حضور جواب دہ قرار پائے، اور اس کے عمل کے نتائج اس کے سامنے آئیں۔ نفس کی اس شہادت کو تسلیم نہ کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ انسان کی فطرت غلط، اس کا شعور باطل اور اس کا وجود عبث ہے۔ لیکن یہ بات کوئی شخص بھی کہنے کے لئے تیار نہیں ہے، مگر کروڑہا انسان پھر بھی اپنے نفس کی شہادت کے خلاف زندگی گذارتے ہیں، اور اس خام خیالی میں مبتلا رہتے ہیں کہ وہ من مانی کرنے کے لئے آزاد ہیں، اور اس کے نتائج کا کبھی انہیں سامنا کرنا نہیں پڑے گا۔

واضح رہے کہ بدکرداری اور پرہیزگاری کا یہ الہام ایک درجہ میں اللہ تعالیٰ کی رہنمائی ہے۔ رہی مکمل رہنمائی تو اس کا سامان اللہ تعالیٰ نے آسمانی ہدایت کے ذریعہ کیا ہے۔ یہ آسمانی ہدایت، جواب قرآن کی شکل میں موجود ہے، اس فطری شعور کو جو انسان کے نفس میں ودیعت ہوا ہے پختہ کرتی ہے اور جلا بخشتی ہے۔ اور یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جن لوگوں تک آسمانی ہدایت نہ پہنچی ہو، وہ بھی اپنے فطری شعور کی حد تک اپنے اچھے اور بُرے اعمال کے ضرور ذمہ دار ہیں، اور اس سلسلہ میں انہیں بھی خدا کے حضور جوابدہی کرنا ہوگی۔

۹۔ متن میں لفظ زَکّٰھَا استعمال ہوا ہے جو تزکیہ سے ہے اور جس کے معنیٰ پاک کرنے اور نشوونما دینے کے ہیں۔ اوپر کی آیت میں نفس پر فجور اور تقویٰ کے الہام کئے جانے کا جو ذکر ہوا ہے اس سے تزکیۂ نفس کا مفہوم بھی واضح ہوتا ہے۔ یعنی نفس کو فجور (برائیوں) سے پاک کرنا اور تقویٰ (خدا خوفی اور پرہیزگاری کی باتوں) سے اس کو نشوونما دینا۔ بالفاظ دیگر اس کی اس طرح تربیت یا پرورش کرنا کہ اس میں خیر اُبھرے اور نیکیاں پروان چڑھیں۔

نفس کا حقیقی ارتقاء اور روح کی بالیدگی اسی وصف کے پیدا کرنے میں ہے۔ اس حقیقت کو اس مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک پودا، اسی صورت میں نشوونما پاتا ہے جب اسے سازگار ماحول مل جائے اور اس کی آبیاری کی جاتی رہے۔ ورنہ تیز ہوا کا ایک جھونکا ہی اس کو خاک میں ملا دینے کے لئے کافی ہوتا ہے۔

اس سورہ میں جو مضمون بیان ہوا ہے اس سے تزکیۂ نفس کا جو اہم ترین پہلو نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے، وہ یہ ہے کہ آدمی سب سے پہلے اپنے آپ کو کفر اور سرکشی سے پاک کر لے، اور ہدایت خداوندی کو قبول کر کے خود کو اطاعت کی راہ پر ڈال دے۔ یہ اطاعت کی راہ شریعت کی راہ ہے جس پر چل کر آدمی نیک کردار اور صالح بن جاتا ہے۔

یہ ہے تزکیۂ نفس کا صاف، سیدھا سادہ اور قرآنی مفہوم۔ اس میں نہ کوئی اشکال ہے اور نہ ابہام۔ اور اس کیلئے نہ کسی فلسفیانہ بحث کی ضرورت ہے اور نہ غیر ضروری باتوں میں الجھنے کی۔ قرآن نے تزکیۂ نفس کے لئے جو بہترین اور نہایت مؤثر نسخہ تجویز کیا ہے وہ ہے خدا کی اعلیٰ و اکمل شریعت، جس پر نہ ''طریقت'' کے اضافہ کی ضرورت ہے اور نہ ریاضتوں کی۔ نہ مراقبوں کا اہتمام کرنے کی ضرورت ہے اور نہ سلوک کی منزلوں سے گذرنے کی۔ بلکہ ایمان و یقین اور خلوص وللّٰہیت کے ساتھ شریعت پر کاربند ہو جانا کافی ہے۔

تزکیۂ نفس کے اس صحیح طریقہ کی طرف رہنمائی کر کے قرآن نے، انسان کو ان تمام غیر فطری اور بوجھل طور طریقوں سے نجات دلائی ہے، جو مذاہب کے پرستاروں نے روح اور آتما کو پاک کرنے (Purification) کے لئے ایجاد کر رکھے ہیں۔ مثلاً یوگا، تپسیا، نفس کشی، رہبانیت وغیرہ۔

اور اس سلسلہ کی آخری بات یہ ہے کہ تزکیۂ نفس کا کام اللہ تعالیٰ کی توفیق کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے نبی ﷺ نے اس دعا کی تعلیم دی ہے۔

اَللّٰھُمَّ! اٰتِ نَفْسِیْ تَقْوَاھَا وَ زَکِّھَا اَنْتَ خَیْرُ مَنْ زَکّٰھَا۔ اَنْتَ وَلِیُّھَا وَ مَوْلَاھَا۔ (مسلم کتاب الذکر)

'' خدایا میرے نفس کو اس کا تقویٰ عطاء فرما اور اس کا تزکیہ کر کہ تو بہترین تزکیہ کرنے والا ہے اور اس کا سرپرست اور مددگار ہے۔''

۱۰۔ یعنی بجائے اس کے کہ تقویٰ اختیار کر کے نفس کا تزکیہ کرتا۔ اس نے فجور (بدی) کی راہ اختیار کر کے نفس کو برائیوں اور گناہوں سے آلودہ کر دیا۔ اس طرح نیکی کے رجحانات کو دبانے اور بدی کے رجحانات کو اپنے اُوپر غالب کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ نفس کا یہ غنچہ، جو کھل کر پھول بن سکتا تھا اور جس کی مہک اس کے پورے وجود کو مہکا سکتی تھی، دب کر اندر ہی اندر مُرجھا گیا۔ اور بقول کسی شاعر کے: ع

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بِن کھلے مُرجھا گئے

آیت ۱ تا ۷ میں جو قسمیں کھائی گئی ہیں اور اس کے بعد جو دعویٰ پیش کیا گیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سورج سے لے کر نفسِ انسانی تک سب کی باگ ڈور اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اور ان سب چیزوں کا وجود اور ان سے پیدا ہونے والی کیفیات، زبان حال سے اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ ان کا خالق، زبردست قدرت کا مالک اور بڑا حکیم و دانا ہے۔ اور جب اس کی قدرت کے آگے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں، اور اس کی حکمت نے انسان کو ایک باشعور اور نیکی و بدی میں تمیز کرنے والی مخلوق بنا کر اٹھایا ہے، تو اس کے لئے صحیح رویہ یہی ہو سکتا ہے کہ وہ اس کی اطاعت و بندگی کی راہ اختیار کرے۔ اور اس احساس کے ساتھ ذمہ دارانہ زندگی گذارے کہ اُسے، اپنے رب کے حضور جوابدہی کے لئے حاضر ہونا ہے اور پھر اپنے عمل کے مطابق جزا یا سزا پانا ہے۔ قرآن اسی حقیقت پر انسان کی نگاہوں کو مرکوز کرنا چاہتا ہے، تاکہ وہ اس کے مطابق اپنی زندگی کو سنوارے۔ اور جب دنیا کے اس امتحان گاہ سے لوٹے تو کامیابی کی منزل اس کے سامنے ہو۔

اس حقیقت کی تائید اگرچہ کہ زمین سے لے کر آسمان تک ہر چیز سے ہو رہی ہے، اور خود نفسِ انسانی کی بھی شہادت یہی ہے۔ تاہم انسان مشکل ہی سے اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے۔ وہ خدائی ہدایت سے بے نیاز رہنا چاہتا ہے۔ اس لئے وہ نافرمانی اور سرکشی کا رویہ اختیار کرتا ہے، جس کے نتیجہ میں اس کے اندر غیر ذمہ دارانہ پن پیدا ہو جاتا ہے اور پھر وہ نیکی و بدی میں کوئی تمیز نہیں کر پاتا۔

یہ نہایت ہی اہم اور وسیع مضمون ہے جو اوپر کی آیات کے اندر سمو دیا گیا ہے۔

۱۱؎ اوپر جو دعویٰ پیش کیا گیا ہے۔اس کی تائید میں یہ تاریخی شہادت پیش کی جارہی ہے کہ سرکشی کا کیسا عبرتناک انجام دنیا کے سامنے آتا رہا ہے۔

قومِ ثمود کا واقعہ قرآن میں متعدد مقامات پر تفصیل سے بیان ہوا ہے۔اس سورہ میں اس کا ذکر مختصراً کیا گیا ہے۔جھٹلانے سے مراد پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام کو جھٹلانا ہے، جو ان کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے تھے۔ثمود کے مسکن وغیرہ کے سلسلہ میں ملاحظہ ہو، سورہ فجر نوٹ ۱۳؎۔

۱۲؎ یہ بدبخت قومِ ثمود کا سردار تھا اور اس کا نام قِدار تھا۔چنانچہ عرب جاہلیت کے اشعار میں اس کا ذکر ملتا ہے۔

اس کو سب سے بڑا بدبخت اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ نہایت سرکش تھا، اور اس نے اپنی قوم کو گمراہ کر کے سرکشی کی بہت بڑی مثال قائم کی۔اور نتیجۃً خود بھی تباہ ہوا اور قوم کو بھی تباہی کے گھاٹ اتار دیا۔

۱۳؎ مراد حضرت صالح علیہ السلام ہیں، جو اس قوم کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجے گئے تھے۔

۱۴؎ قوم ثمود نے حضرت صالح علیہ السلام سے مطالبہ کیا تھا کہ اگر واقعی وہ خدا کے رسول ہیں تو کوئی معجزہ (نشانی) پیش کریں۔ان کے اس مطالبہ پر اللہ تعالیٰ نے اونٹنی کو معجزہ کے طور پر پیش کر دیا۔چونکہ یہ اونٹنی معجزہ کے طور پر پیش کی گئی تھی اس لئے اسے ''ناقۃ اللہ'' اللہ کی اونٹنی کہا گیا۔

اس معجزے نے جہاں ان کا مطالبہ پورا کر دیا وہاں ان کو آزمائش میں بھی ڈال دیا۔اور اس کی صورت یہ ہوئی کہ حضرت صالح نے کہا کہ ایک دن اس کے پانی پینے کے لئے مخصوص ہوگا اور دوسرا دن تمہارے لئے اور تمہارے جانوروں کے پانی پینے کے لئے ہوگا۔اور متنبہ کیا کہ اونٹنی کو گزند نہ پہنچانا ورنہ اللہ کا عذاب تمہیں آلے گا۔لیکن قوم نے اپنے سرکش سردار کو اس بات پر اُکسایا کہ وہ اس اونٹنی کا قصہ تمام کر دے۔

۱۵؎ اونٹ کو جب مارنا ہوتا تو اس کی کوچیں کاٹ ڈالی جاتی تھیں جس کے بعد وہ مرجاتا تھا۔یہی طریقہ ثمود کے لوگوں نے اللہ کی اونٹنی کو مارنے کے لئے اختیار کیا اور اس غرض کے لئے سب نے مل کر اپنے بدترین سردار کو آگے کیا تھا، اس لئے پوری قوم اس کی مجرم قرار پائی۔

۱۶؎ یعنی ان کو اس طرح تباہ کر دیا کہ وہ خاک میں مل گئے اور ملیامیٹ ہو گئے۔

۱۷؎ یعنی اللہ کو دنیا کے حکمرانوں پر قیاس نہ کرو جو کسی مجرم گروہ کو سزا دیتے وقت اندیشہ محسوس کرتے ہیں کہ اس کا کیا نتیجہ نکلے گا، اور اس سے کہیں ان کا اقتدار تو خطرہ میں نہیں پڑے گا۔اللہ تعالیٰ کا اقتدار سب سے بالاتر ہے اور وہ سب پر غالب ہے۔اس لئے جب وہ کسی قوم کو سزا دینا چاہتا ہے تو اسے کسی قسم کا اندیشہ لاحق نہیں ہوتا۔

۹۲۔ الیل

نام پہلی آیت میں لیل (رات) کی قسم کھائی گئی ہے۔اس مناسبت سے اس سورہ کا نام ''الّیل'' ہے۔

زمانۂ نزول مکی ہے اور مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دعوت کے ابتدائی مرحلہ میں نازل ہوئی۔

مرکزی مضمون یہ واضح کرنا ہے کہ انسان کی کوششوں کے دو مختلف رخ ہیں، جس کا تقاضا ہے کہ دونوں کے اثرات ونتائج بھی مختلف ہوں، اور منزلیں بھی الگ الگ ہوں۔اس سورہ کا مضمون، سورۂ الشّمس کے مضمون سے گہری مناسبت رکھتا ہے۔اُس میں نفس کو پاک کرنے اور آلودہ کرنے کا انجام بیان کیا گیا تھا۔اس سورہ میں اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ نفس کو پاک کرنے والی چیزیں کیا ہیں، اور آلودہ کرنے والی چیزیں کیا۔

نظم کلام آیت ۱ تا ۴ میں چند شہادتوں کو پیش کر کے اس پر استدلال کیا گیا ہے کہ انسان کی سعی وعمل، جب مختلف ہے تو ضروری ہے کہ اس کے نتائج بھی مختلف ہوں۔

آیت ۵ تا ۱۱ میں اچھے اور بُرے کردار کی چند خصوصیات پیش کر کے واضح کیا گیا ہے کہ اچھی خصوصیات نیکی کی راہ ہموار کرتی ہیں، اور بُری خصوصیات بدی کی راہ کو۔

آیت ۱۲ تا ۱۴ میں واضح کیا گیا ہے کہ اللہ کا کام ہدایت کی راہ دکھا دینا ہے۔اور اس نے یہ راہ تمہیں دکھا دی ہے۔دنیا اور آخرت کا مالک وہی ہے۔اس لئے اس نے تمہیں خبردار کر دیا ہے کہ آخرت میں کیا کچھ پیش آنے والا ہے۔

آیت ۱۵ تا ۲۱ میں بتایا گیا ہے کہ بدکردار لوگ کس طرح برے انجام سے دوچار ہوں گے، اور نیک کردار لوگوں کا انجام کتنا خوشگوار ہوگا۔

سُوْرَةُ الَّيْلِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ﴿۱﴾
وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ﴿۲﴾
وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰٓى ﴿۳﴾
اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ﴿۴﴾
فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ﴿۵﴾
وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ﴿۶﴾
فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ﴿۷﴾
وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ﴿۸﴾
وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ﴿۹﴾
فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ﴿۱۰﴾
وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى ﴿۱۱﴾
اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ﴿۱۲﴾
وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى ﴿۱۳﴾
فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ﴿۱۴﴾
لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ﴿۱۵﴾
الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۱۶﴾
وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ﴿۱۷﴾
الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ﴿۱۸﴾
وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ﴿۱۹﴾
اِلَّا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ﴿۲۰﴾
وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ﴿۲۱﴾

۹۲ـ سُوْرَةُ الَّيْلِ

آیات:۲۱

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے۔

۱ قسم ہے ۱؎، رات کی جب وہ چھا جائے، ۲؎
۲ اور دن کی جب وہ روشن ہو، ۳؎
۳ اور اس ذات کی ۴؎، جس نے نر اور مادہ پیدا کئے۔ ۵؎
۴ یقیناً تمہاری کوششیں مختلف ہیں۔ ۶؎
۵ تو جس نے ۷؎، (مال) دیا ۸؎، اور پرہیزگاری اختیار کی، ۹؎
۶ اور بہترین بات کو سچ مانا، ۱۰؎
۷ اس کیلئے ہم آسانی کو پہنچنے والی راہ ہموار کردیں گے۔ ۱۱؎
۸ اور جس نے بخل کیا ۱۲؎، اور بے نیازی برتی، ۱۳؎
۹ اور بہترین بات کو جھٹلایا، ۱۴؎
۱۰ اس کے لئے ہم سختی کو پہنچنے والی راہ ہموار کردیں گے۔ ۱۵؎
۱۱ اور جب وہ گڑھے میں گرے گا تو اسکا مال اسکے کچھ کام نہ آئے گا۔ ۱۶؎
۱۲ بلاشبہ راہ دکھانا ہمارے ذمہ ہے۔ ۱۷؎
۱۳ اور آخرت اور دنیا، دونوں ہمارے ہی اختیار میں ہیں۔ ۱۸؎
۱۴ تو میں نے تم کو بھڑکتی آگ سے خبردار کردیا ہے۔
۱۵ اس میں وہی پڑے گا جو بڑا بدبخت ہوگا، ۱۹؎
۱۶ جس نے جھٹلایا اور روگردانی کی۔
۱۷ اور اس سے ایسے شخص کو بچالیا جائے گا جو نہایت پرہیزگار ہے، ۲۰؎
۱۸ جو اپنا مال پاکیزگی حاصل کرنے کی خاطر دیتا ہے۔ ۲۱؎
۱۹ اور اسکے نزدیک کسی کے حق میں کوئی احسان بدلہ کیلئے نہیں ہے، ۲۲؎
۲۰ بلکہ وہ صرف اپنے ربّ برتر کی رضاجوئی کیلئے دیتا ہے۔ ۲۳؎
۲۱ اور وہ ضرور خوش ہوگا۔ ۲۴؎

۱۔ قسم کی تشریح کے لئے ملاحظہ ہو سورۂ تکویر نوٹ ۱۴۔

۲۔ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ رات کی خصوصیت تاریکی ہے۔ جب وہ آجاتی ہے تو سب پر تاریکی چھا جاتی ہے۔

۳۔ یعنی رات کے بالمقابل دن کی خصوصیت روشنی ہے۔ جب وہ نمودار ہوتا ہے تو سب چیزیں روشن ہوجاتی ہیں۔

۴۔ مراد خالق کی قسم ہے۔ اور خالق کی قسم یہاں بات کو مؤکد کرنے، اور دعوے کو قطعیت کے ساتھ پیش کرنے کیلئے ہے۔

۵۔ نر و مادہ جانوروں میں بھی پیدا کئے اور انسانوں میں بھی۔ یہ جنسی اختلاف اپنی خصوصیات رکھتا ہے۔ جو خصوصیت مرد کی ہے وہ عورت کی نہیں اور جو عورت کی ہے وہ مرد کی نہیں۔

۶۔ یہ ہے وہ حقیقت جس پر مذکورہ قسمیں کھائی گئی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کائنات کی تخلیق اس طرح ہوئی ہے کہ اس میں، چیزیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اور الگ الگ خصوصیات کی حامل ہیں۔ مثال کے طور پر رات اور دن باہم مختلف ہیں اور اگر ایک کی خصوصیت تاریکی پھیلانا ہے، تو دوسرے کی خصوصیت روشنی پھیلانا۔ مرد اور عورت بھی جنسی اعتبار سے باہم مختلف ہیں۔ اور اگر ایک میں فعالیت کی خصوصیت پائی جاتی ہے، تو دوسرے میں انفعالیت کی۔ اگر ایک صنف میں باپ بننے کی خصوصیت پائی جاتی ہے، تو دوسری صنف میں ماں بننے کی۔ یہی حال انسان کی کوششوں کا ہے کہ کوئی نیکی اور بھلائی کا طرز عمل اختیار کرتا ہے، تو کوئی بدی اور شر کا۔ کوئی خدا کا وفادار بندہ بنکر رہتا ہے تو کوئی نافرمان اور سرکش بنکر، کوئی ایک سچے خدا کو مانتا ہے تو کسی نے ہزاروں جھوٹے خدا بنا رکھے ہیں۔ کسی کی تگ و دو خیر کی راہ میں ہوتی ہے اور کسی کی شر کی راہ میں۔ کوئی مفسد اور ظالم بن کر اٹھتا ہے اور کوئی مصلح بنتا اور انصاف کی ترازو قائم کرتا ہے، کوئی دنیا میں مزے اڑاتا ہے اور کوئی فرض شناسی کا ثبوت دیتا ہے۔ میدانِ کار میں انسان کی کوششوں کا یہ تفاوت بھی اپنے اندر مختلف خصوصیات اور اپنے الگ الگ اثرات رکھتا ہے۔ اور یہ صورتحال اس بات کی متقاضی ہے کہ ان کے الگ الگ نتائج رونما ہوں۔ اور جب دنیا کی حیثیت دار العمل اور دار الامتحان کی ٹھہری، تو ایک دار الجزاء کی ضرورت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ پس قرآن کا یہ دعویٰ کہ آخرت دار الجزاء ہے۔ جہاں نیکی اور بدی کے الگ الگ نتائج رونما ہوں گے اور انسان اپنی سعی و عمل کے مطابق جزا یا سزا پائے گا، ٹھیک اسی حقیقت کے مطابق ہے، جو مظاہر کائنات پر غور کرنے سے ابھر کر سامنے آتی ہے۔

جو لوگ اتنی بڑی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے وہ انتہائی غیر معقولیت کا ثبوت دیتے ہیں۔ کیوں کہ ان کے نزدیک ہر چیز اپنی ایک خصوصیت رکھتی ہے، لیکن اگر کوئی چیز اپنی خصوصیت نہیں رکھتی تو وہ اخلاقی اور غیر اخلاقی رویّہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہر چیز اپنا اثر رکھتی ہے، لیکن اگر کوئی چیز اثر نہیں رکھتی تو وہ نیکی اور بدی ہے۔ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ ہر کام کا ایک نتیجہ ہے۔ لیکن ان کے نزدیک اگر کوئی کام بے نتیجہ ہے تو وہ خدا کی اطاعت اور اس کی نافرمانی کے کام ہیں کہ دونوں طرز عمل یکساں ہیں، اور ان کا کوئی اچھا اور بُرا نتیجہ برآمد ہونے والا نہیں۔ انسان خدا پر ایمان لائے یا کفر کرے، اس کی ہدایت کو تسلیم کرے یا نہ کرے۔ نتیجہ کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بتایئے اس سے بڑھ کر نادانی کی بات اور کیا ہوسکتی ہے ؟

۷۔ یہاں اچھے اور بُرے طرز عمل کا فرق واضح کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں پہلے چند، ان اوصاف کا ذکر کیا گیا ہے جو انسان کو سنوارتے اور اس کے کردار کی تعمیر کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ خصلتیں بیان کی گئی ہیں جو انسان کو بگاڑتے اور اس کو بدکردار بناتے ہیں۔

۸۔ مراد بھلائی کے کاموں میں خرچ کرنا ہے۔

۹۔ یعنی اللہ سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرے۔ جو کام اس کی ناراضگی کے ہیں ان سے پرہیز کرے۔

۱۰۔ بہترین بات (اَلْحُسْنیٰ) سے مراد وہ بات ہے جس کی قرآن دعوت دے رہا ہے۔ یعنی کلمۂ توحید کو قبول کرنے اور آخرت پر ایمان لانے کی دعوت۔

۱۱؎ یعنی نیکی کی راہ پر چلنا اس کیلئے آسان ہوگا اور اس پر چل کر وہ اس منزل تک پہنچ جائے گا، جہاں آسانیاں ہی آسانیاں اور راحت ہی راحت ہے۔ نیکی کی راہ گو سخت دشوار گذار راہ ہے۔ لیکن اس پر چلنا ان لوگوں کیلئے آسان ہو جاتا ہے، جو خدا اور آخرت پر ایمان لا کر تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔ اور اللہ کی خوشنودی کی خاطر اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ گویا یہ توفیق اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو بخشتا ہے، جو راہِ حق پر چلنے کی ہمت کرتے ہیں اور اس کی بنیادی شرطیں پوری کر دیتے ہیں۔

۱۲؎ بخل سے مراد نیکی اور بھلائی کے کاموں میں مال خرچ نہ کرنا ہے۔ اور اس لحاظ سے وہ شخص بھی بخیل ہے جو اپنے عیش و آرام اور دوسرے نمائشی کاموں پر تو خوب خرچ کرتا ہے۔ لیکن خدا اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی اس پر گراں گذرتی ہے۔

موقع کلام کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ بخل اور زر پرستی، وہ اخلاقی برائیاں ہیں جو نفس کو آلودہ کر دیتی ہیں۔ اور پاکیزگی اختیار کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی راہِ خدا میں خرچ کرے۔

۱۳؎ بے نیازی برتنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی، خدا اور اس کی ہدایت سے بالکل بے تعلق ہو جائے۔ اور اسے اس بات کی کوئی پروا، نہ ہو کہ خدا کی خوشنودی کن کاموں کے کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اور اس کا غضب کس طرح کے کام کرنے سے ٹوٹ پڑتا ہے۔

استغناء (بے نیازی برتنے) کا لفظ تقویٰ (خدا خوفی اور پرہیزگاری) کے بالمقابل استعمال ہوا ہے۔ اس لئے اگر تقویٰ خدا خوفی کے زیر اثر ذمہ دارانہ زندگی گذارنے اور فرض شناسی کا ثبوت دینے کا نام ہے، تو استغناء یہ ہے کہ آدمی خدا سے بے پروا ہو کر غیر ذمہ دارانہ زندگی گذارے اور نافرض شناسی کا ثبوت دے۔

۱۴؎ بہترین بات کی تشریح اوپر نوٹ ۱۰؎ میں گذر چکی ہے۔

۱۵؎ یعنی بدی کی راہ چلنا اس کے لئے آسان ہوگا اور اس پر چل کر وہ اس کٹھن منزل تک پہنچ جائے گا، جہاں سختیاں ہی سختیاں ہیں۔ بدی کی راہ اس لحاظ سے آسان ہے کہ اس پر چلنے والا اپنی خواہشات کی پیروی کرتا ہے، اور اس میں اسے مادی فائدے بھی حاصل ہوتے ہیں، اور دنیوی لذتیں بھی۔ جو شخص ان جلد ملنے والے فائدوں کے لالچ میں آ کر اس غلط راہ کا انتخاب کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو اس پر چلنے کے لئے ڈھیل دیتا ہے۔ اور اس کے لئے وہ وسائل فراہم کر دیتا ہے جو برائیوں کے ارتکاب کو اس کیلئے آسان بنا دیتے ہیں۔ لیکن بالآخر آسانیاں اسے نہایت کٹھن منزل پر لیجا کر چھوڑ دیتی ہیں۔

۱۶؎ گڑھے میں گرنے سے مراد ہلاکت کے گڑھے میں گرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ مال جسے آدمی جمع کرتا ہے اور بھلائی کے کاموں میں صرف نہیں کرتا اس کے لئے کچھ بھی مفید نہ ہوگا، بلکہ موجب ہلاکت ہوگا۔ اگر وہ خدا کی خاطر بھلائی کے کاموں میں صرف کرتا، تو یہ اس کی اخروی زندگی کیلئے محفوظ سرمایہ بن جاتا۔

۱۷؎ یعنی جہاں تک انسان کو راہ راست دکھانے کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ نے یہ ذمہ ضرور لیا ہے۔ اور یہ کام اس نے اپنے پیغمبر کو بھیج کر اور اپنی اس کتاب کو نازل کر کے پورا کر دیا ہے۔ رہا راہِ راست کو اختیار کرنا تو یہ انسان کی اپنی ذمہ داری ہے۔ کرے گا تو کامیاب ہوگا اور نہیں کرے گا تو نامراد ہوگا۔

۱۸؎ یعنی دنیا و آخرت دونوں جہانوں کے مالک ہم ہی ہیں۔ اور دونوں کا نفع نقصان ہمارے ہی ہاتھ میں ہے۔ لہٰذا جو شخص دنیا کے مادی فائدوں کی خاطر راہ راست کو اختیار نہیں کرتا اسے سمجھ لینا چاہئے کہ دنیا میں، وہ اتنے ہی فائدے حاصل کر سکے گا جتنے کہ اس کی گمراہی کے باوجود اس کا خدا اُسے پہنچانا چاہے۔ اس سے زیادہ وہ دنیا میں کچھ حاصل نہیں کر سکے گا۔ رہی آخرت تو وہاں ایسے لوگوں کے لئے محرومی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

۱۹؎ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو کم درجہ کا بد بخت ہوگا وہ آگ میں نہیں پڑے گا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس سورہ کے نزول کے وقت جو دو کردار کے لوگ سامنے تھے، ایک وہ جو پیغمبر کو جھٹلا رہے تھے اور وہ جس ہدایت کو لے کر آیا ہے اس سے منہ موڑ رہے تھے۔ اور دوسرے وہ جو پیغمبر کی تصدیق کر رہے تھے اور اس کی لائی ہوئی ہدایت کو قبول کر کے اپنا مال راہ خدا میں خرچ کر رہے تھے۔ ان میں سے پہلے کردار کے لوگ ہی یعنی پیغمبر کو جھٹلانے والے، بھڑکتی آگ میں پڑیں گے نہ کہ دوسرے کردار کے لوگ جو پیغمبر کی تصدیق کر رہے تھے۔ اُن جھٹلانے والوں کو انتہائی بد بخت (اَشْقیٰ) اسلئے فرمایا کہ جب پیغمبر نے براہِ راست ان لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچا دیا، جس کی وجہ سے اللہ کی حجت ان پر پوری طرح قائم ہوگئی، پھر بھی وہ انکار کرتے رہے تو ان سے زیادہ بد بخت اور کون ہوسکتا ہے۔

قرآنی آیات کا مفہوم متعین کرتے وقت موقع و محل اور ان حالات کو، جن میں وہ آیات نازل ہوئی ہیں ملحوظ رکھنا ضروری ہے، نیز کسی آیت کا ایسا مطلب لینا بھی صحیح نہ ہوگا جو قرآن کے دوسرے بیانات سے ہم آہنگ نہ ہو۔

۲۰؎ یہاں بھی کہنے کا منشاء یہ نہیں ہے کہ صرف بڑے متقی ہی آگ سے بچائے جائیں گے اور عام متقی نہیں بچائے جائیں گے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو دو کردار اُبھر کر سامنے آگئے ہیں۔ اور یہ اس سورہ کے نزول کے وقت اور پیغمبر کی موجودگی میں اُبھر کر سامنے آگئے تھے۔ ان میں سے صرف دوسرے کردار کے لوگ ہی آگ سے بچا لئے جائیں گے، جنہوں نے اپنے متقی (پرہیز گار) ہی نہیں بلکہ اتقیٰ (نہایت پرہیز گار) ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ رہے اشقیٰ تو وہ لازماً آگ میں پڑیں گے جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ واضح رہے کہ جن لوگوں نے ابتداء ہی میں رسول کی دعوت قبول کر لی تھی اور اللہ سے ڈرتے ہوئے اپنے اندر پاکیزگی پیدا کر رہے تھے، انہوں نے بہت بڑے حوصلہ کا ثبوت دیا تھا۔ اس لئے ان کا درجہ بہت بڑا ہے اور تقویٰ کے اعلیٰ معیار پر ہونے کی وجہ سے وہ سب اتقیٰ (نہایت پرہیز گار) ہیں۔

۲۱؎ معلوم ہوا کہ راہ خدا میں مال خرچ کرنا تزکیۂ نفس کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ کیوں کہ اس سے زر پرستی اور دنیا پرستی کی جڑ کٹ جاتی ہے اور خدا پرستی اور آخرت پسندی کا جذبہ پرورش پانے لگتا ہے۔

۲۲؎ یعنی وہ جو کچھ کسی کو دیتا ہے بدلہ کی غرض سے نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک کسی کی مدد کرنا اس کو ممنون احسان کرنے کے لئے نہیں ہے کہ اس سے کسی نہ کسی شکل میں اس کا بدلہ مطلوب ہو۔ بلکہ وہ خلوص کے ساتھ اور بے لوث ہو کر مدد کرتا ہے۔

۲۳؎ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انفاق وہی مقبول ہے جو خالصۃً اس کی رضا جوئی کے لئے کیا جائے۔ اور ایسے ہی انفاق سے نفس کا تزکیۂ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جو انفاق کسی پر احسان دھرنے یا شہرت و ناموری حاصل کرنے کی غرض سے کیا جائے، اس سے نہ اللہ کی رضا حاصل ہوتی ہے اور نہ نفس کا تزکیہ ہوتا ہے۔

۲۴؎ یعنی جس شخص کا کردار یہ ہے اُسے اس کا رب اس طرح نوازے گا کہ وہ خوش ہوجائے گا۔ یہ آیت صرف دو لفظوں پر مشتمل ہے لیکن اس کے اندر مذکورہ اوصاف کے حاملین کے لئے بشارتوں کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔